نگارشاتِ ادب

کا[illegible]وانِ خیال

خطوط

مولانا ابوالکلام آزاد

[illegible]ب مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

سنگِ میل پبلیکیشنز ○ لاہور

کاروانِ خیال

خطوط

مولانا ابوالکلام آزاد

بنام

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی

سنگ میل پبلی کیشنز

چوک اردو بازار۔ لاہور ۲

نیاز احمد نے پنجاب پریس سے چھپوا کر سنگ میل پبلی کیشنز
سے شائع کی۔

حامداً و مصلیاً و مسلماً

مقدمہ

قلم را آں زبان نبود کہ سرِّ عشق گوید باز
بروں از حدِ تقریر است شرحِ آرزومندی

ستمبر ۱۹۴۰ء کے دوسرے ہفتے کا ذکر ہے۔ میں حسبِ معمول نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی دامت معالیہ کی خدمت میں حبیب گنج حاضر ہوا۔ تو موصوف نے قدیم شفقتِ بزرگانہ کے تحت کلکتہ سے آیا ہوا ایک خط دکھایا۔ میں اسی سال اجمیر شریف سے فارغ عن التحصیل ہو کر حضرت الاستاذ علامۃ الہند مولانا محمد معین الدین الاجمیری کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد خاندانی دار العلوم مدرسہ حافظیہ سعیدیہ دادوں ضلع علی گڑھ میں (جو حبیب گنج سے دو میل پہ واقع ہے) مدرس ہوا تھا۔

نواب صاحب نے علامہ طیبی المتوفی سنہ ۷۴۳ھ مطابق سنہ ۱۳۴۳ء کی

شرح مشکوٰۃ[له] کے دو کرم خوردہ قلمی نسخے اپنے مشہور کتاب خانہ کے لئے حاصل کئے تھے۔ کتاب کی اہمیت اور نایابی کی بنا پر مفتی عبداللطیف صاحب صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نسخہ منگا کر، ناظم کتاب خانہ سے اس کی نقل کرا رہے تھے۔ مجھے بھی اس کی نقل کا اشتیاق ہوا۔ پہلے تو پس وپیش فرمایا، آخر میری بار بار کی گذارش پر اجازت مرحمت فرمائی۔ میں ہر ہفتے جمعہ کو مدرسہ کی چھٹی کے دن جا کر نقل شدہ اجزا لئے کتاب داخل کر کے دوسرے لے آتا۔ اسی سلسلے میں ہر ہفتے کتاب خانہ اور صاحبِ کتاب کی زیارت کا موقع ملتا۔

جب وہ کلکتہ سے آیا ہوا خط دیکھا تو کیا عرض کروں، دل پہ کیا گذری۔ ایک بار نہیں، بار بار پڑھا، ہر بار نیا کیف و سرور حاصل ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس محبت نامہ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء میں الفاظ نہ تھے۔ بلکہ موتی

[له] ملا علی قاری نے مرقات شرح مشکوٰۃ اور مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے لمعات و اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں اور دوسرے شارحین حدیث نے جا بجا طیبی کا حوالہ دیا ہے۔ محققانہ و فقیہانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کی چار جلدیں ہیں، تقریباً دو ہزار صفحات ہیں۔ میں نے دو سال کے اپنی درسی و خانگی مصروفیات کے باوجود برادرِ عزیز مولوی محمد زاہد خاں شروانی سلمہٗ کی مدد سے پوری کتاب نقل کر کے مقابلہ کر ڈالا۔ ناظمِ کتاب خانہ مولوی معین الدین افضل گڑھی نے بھی مقابلہ میں عرق ریزی سے کام لیا۔ اس کے نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ فتح پوری دہلی، کتاب خانہ قاضی رام پور میں موجود ہیں۔ صحیح اور قریب العہد نسخہ رام پور کا ہے جو کوششوں کے باوجود مقابلہ کے لئے حاصل نہ ہوسکا۔ فتح پوری دہلی کا نسخہ ملا، بد خطی اور اغلاط سے پُر ہے۔ نواب صاحب کا ارادہ مصر میں چھپوانے کا تھا جو جنگ کی دشواریوں کی وجہ سے معرضِ التواء میں پڑ گیا، سہولتیں ملنے پر اولین فرصت میں اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔ شاہد شروانی

تھے جو سلکِ سطور میں پرو دیئے گئے تھے۔ دل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو صفحۂ کاغذ پر بتصورِ صحبتِ گذشتہ سے متاثر ہو کر اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی تھی ؎

شاید ان ذرّوں میں تصویریں کھنچی ہوں آپ کی
یہ سمجھ کر منتشر اجزائے دل یک جا کئے

لکھنے والے کا انداز بتا رہا تھا کہ کسی کی اچانک یاد نے دل تڑپا دیا ہے اور قلم برداشتہ دل کی بے قید اور "آزاد" صداؤں کو گوشِ "حبیب" تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ میں نے اس نامہ گرامی کے نقل کی بتوسط ماسٹر سید منظہر علیم استدعا کی جو منظور ہوئی۔ جب نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہو گیا تو "مراسلتِ حبیبین" کے نام سے فائل بنا لیا گیا۔ اور ماسٹر صاحب مرحوم کے زیرِ نگرانی زینت کتاب خانہ بنا۔ میں ۲۷ ستمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا آزاد کی طلب پر جب دہلی حاضر خدمت ہوا اور "غبارِ خاطر" کی اشاعت کا تذکرہ آیا، تو میں نے خطوطِ قبلِ نظر بندی کے شمول کی بھی آرزو ظاہر کی اور ارشادِ گرامی کے مطابق وہ سب مکاتیب نواب صاحب کی منظوری اور تصدیقی دستخط ثبت کرا کے، بالترتیب نقل کر کے خدمتِ والا میں روانہ کر دیئے۔ کسی مصلحت کی بنا پر وہ خطوط شاملِ غبارِ خاطر نہ ہو سکے۔ ان مکاتیب میں علمی، ادبی اور تاریخی معلومات کا بے بہا ذخیرہ تھا، اہلِ علم و ادب کو اس مجموعہ سے محروم دیکھ کر کفِ افسوس ملنا پڑا۔

منتظر موقع تھا کہ دونوں بزرگوں سے گذارش کر کے منصۂ شہود پر لانے کی کوشش کروں کہ رفیق محترم سید الطاف علی بریلوی سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے حبیب گنج پہنچ کر "السّابقون الأوّلون" کا درجہ

حاصل کر لیا، نہ صرف اہلِ علم و ادب بلکہ کانفرنس کے شکریہ کے مستحق بھی ٹھہرے کیونکہ اس کے حقوقِ منفعت کانفرنس کے لئے محفوظ کرا لئے۔ سیّد صاحب سے کئی بار اس مراسلت کا ذکر آ چکا تھا۔ غالب نے شاید اسی موقع کے لئے یہ شعر کہا تھا ؎ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مجھ پر ان دونوں گرامی قدر ہستیوں کی شفقت و توجہ کا حال موصوف کو اچھی طرح معلوم تھا ہی۔ اس مجموعۂ خطوط کا جسے اب "کاروانِ خیال" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، دیباچہ لکھنے کی پیش کش کی۔

ملک کے دو مسلّم الثبوت ادیب، بے مثال انشاء پرداز، یگانۂ روزگار فاضل اور صفِ اوّل کے مشاہیر کی تحاریر پر قلم اٹھانا بڑی دیدہ دلیری اور جرأت کا کام تھا۔ ہوش نے ہمت شکنی اور شوق نے حوصلہ افزائی کی، ہوش و شوق کی اس کشمکش نے انسان ظلوم و جہول کے ازل میں بارِ امانت اٹھانے کا واقعہ یاد دلایا جس کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ؕ"

جب اس بارِ عظیم (خلافتِ الٰہی) کو غافل انسان نے اٹھا لیا جس کا نام سن کر آسمان کو لرزہ اور زمین کو زلزلہ آ گیا تھا، سمندر کپکپانے اور پہاڑ تھرتھرانے لگے تھے۔ تو اسی نوعِ انسانی کا ایک فرد ہو کر ہمت ہار جانا دیرینہ روایات کے سراسر خلاف تھا۔ یہ دونوں باکمال بزرگ تقریباً نصف صدی سے مشاہیرِ ہند میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں میں "عام خاص من وجہ" کی نسبت

ہے۔ دو مادۂ افتراق اور ایک مادۂ اجتماع پایا جاتا ہے۔ جہادِ حریت میں ایک برسرِ پیکار اور انتظامِ امورِ ریاست میں دوسرا سرگرمِ کار۔ بقاءِ شانِ اسلاف یعنی پابندیِ وضع و تہذیبِ اسلامی اور ذوقِ علمِ تاریخ و ادب میں دونوں متحد، ذوق کی یک جہتی نے مادۂ اجتماع کو افتراق پر غالب کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ۱۹۰۵ء کی پہلی ملاقاتِ لکھنؤ کے بعد دونوں کے تعلقات میں رابطہ اور رابطہ میں استواری پیدا ہوتی رہی۔ ایک نے حیدر آباد جا کر مسندِ صدارت امورِ شرعیہ سنبھالی اور دوسرے نے رانچی (بہار) کو ایامِ نظر بندی اور سرکاری مہمان خانوں کو زمانہ اسیری میں پہنچ کر آباد کیا۔ راہوں کے اس بُعد المشرقین نے بھی ذوق کی یکسانی میں فرق نہ آنے دیا۔ اور اس چالیس سال کی مدت میں اخلاق و مودت نے

اتحادیست میانِ من و تو

من و تو نیست میانِ من و تو

کی شکل اختیار کر لی۔ "غبارِ خاطر" اسی کی ایک جھلک اور "کاروانِ خیال" اسی کا دوسرا پرتو ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر کے متعلق مجلہ مصنف علی گڑھ جنوری ۱۹۴۶ء میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ خدا نے موصوف کو بڑی صلاحیتوں کا مالک بنایا ہے۔ عزت و عظمت، دولت و ریاست، جاہ و حشم اور علم و فضل کی نعمتوں سے سرفراز اور معاصرین میں یک گونہ ممتاز ہیں۔ آپ کا جمع کردہ نادر الوجود کتب خانہ ہندوستان کے معدودے چند مشہور کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ ہند و بیرونِ ہند کے فضلاء آ کر استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ جرمنی و بغداد و غیرہا کو کتابیں مقابلے کے لئے جاتی رہتی ہیں۔ بیسیوں کتابوں کے مؤلف اور کئی مفید تصانیف کے مصنف ہیں۔ علمی و تاریخی مقالاتِ

مطبوعہ و غیر مطبوعہ کا مجموعہ پریس میں پہنچ چکا ہے۔ دیوانِ فارسی و اُردو مُرتّب ہو چکے ہیں۔ اسّی سال سے متجاوز سن ہے۔ مگر تحریر و تقریر میں وہی شگفتگی و شوخی ہے۔ جادۂ ادب کے پرانے سالک اور مخصوص طرزِ نگارش کے مالک ہیں۔ نظم کی طرح نثر میں بھی شاعری فرما لیتے ہیں۔ ۱۳۱۴ھ میں اپنی تصنیف "علماء سلف" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"شوال ۱۳۱۱ھ کا ذکر ہے کہ ندوۃ العلماء کا اجلاس شہر کانپور میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں دیارِ ہند کے اکثر مشاہیر علماء رونق افروز تھے۔ بزم ان کے جمالِ کمال سے روشن تھی اور نگاہ ان کے کمالِ جمال سے منور۔"

خط کشیدہ جملہ بار بار پڑھیئے اور سر دھنیئے۔ پورے پچاس سال قبل کا جملہ ملاحظہ فرمالیا۔ اب حال کا فقرہ یعنی اسّی سالہ زندگی کا تجربہ و حاصل بھی معائنہ کرتے چلیئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو جواب مکتوب مذکور میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔"

اِس جملۂ حق کی شرح، دلِ درد مند آزاد سے پوچھیئے۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء کے خط میں صفحے کے صفحے رنگین کر ڈالے ہیں۔ نواب صاحب کی ادبی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ سارے ملک میں آزاد کی مخصوص علمی و ادبی مخاطبت و مراسلت کے لئے اب موصوف ہی کی ذات رہ گئی ہے۔ فرصت کے لمحے اور تنہائی کی گھڑیاں ان ہی سے مخاطبت میں صرف ہوتی ہیں اور علّامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی جیسے فاضلِ یگانہ تک کو رشک ہوتا ہے۔ کہ ان خطوطِ مودّت کے "مخاطبِ تنہا صدیقِ مکرّم حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہیں[۱]..."

---

[۱] معارف بابت جون ۱۹۴۶ء، صفحہ ۴۰۳

پچھلی مرتبہ مارچ ۴۶ء میں یوپی وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں لکھنؤ پہنچنے اور نواب صاحب کے ورود بلدہ کی اطلاع ملنے پر جلائے قیام پہ پہنچ کر والہانہ انداز میں بغل گیر ہوئے۔ مختصر مگر پر لطف صحبت رہی۔ مشغولیتِ کار اور ہجوم افکار کے باوجود ملاقات کا موقع اُستاد ذوق کے ارشاد کے مطابق نکال ہی لیا۔

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اس ملاقات کا ذکر نواب صاحب نے آخری خط میں کس مزے سے کیا ہے۔ دوبارہ ملنے کی سعی ناکام پہ کیسے حسرت آمیز فقرے لکھے ہیں۔ "غبارِ خاطر" نے دونوں کے تعلقات سے خاص و عام کو کافی روشناس کر دیا ہے۔

مدت کے بعد مولانا کے قلم کی گُل کاریاں نظر نواز ہوئی تھیں، مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مئی کے شروع میں پانچ ہزار کی تعداد میں یہ مجموعہ مکاتیب چھپا اور آخر ماہ تک ختم ہو گیا، پیہم طلب پہ دوسرا ایڈیشن اتنا ہی تیار ہوا جو قریب ختم ہے۔

مولانا کے سینکڑوں مضامین و خطوط نظر سے گذرے۔ میری علمی تہی مایگی اور ادبی بے بضاعتی آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سا مضمون یا خط فصاحت و بلاغت، روانی و سلاست میں دوسروں سے فوقیت رکھتا ہے۔ شادی و مسرت کا موقع ہو یا حزن و الم کا، عیش و عشرت کے سامان مہیا ہوں یا رنج و غم کے، تبریک و تہنیت کا محل ہو یا تعزیت و عیادت کا، ہر جگہ اشہبِ قلم یکساں دوڑتا نظر آئے گا۔ گویا نگاہوں کے سامنے وسیع میدان

ادب ہے۔ رخشِ خامہ کو جدھر مہمیز لگا دی ہوا ہو گیا۔

یوں تو آزاد کی ہر تصنیف و مضمون میں ادبی شان پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے، لیکن مجموعۂ خطوط "غبارِ خاطر" کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد کو سیفِ زبان و بیان پر کس قدرت حاصل ہے۔ الفاظ کی قطع و برید، حرفوں کی تراش خراش دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے ؏

زکدام باغ اے گُل کہ چنیں خوش است بویت

الفاظ فصاحت کے سانچے میں ڈھلتے جا رہے ہیں اور خاتمِ عبارت میں نگین بن کر جڑے جا رہے ہیں۔

جب انسان میں کوئی کمال پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا صدور و ظہور بلا قصد و ارادہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ آپ نے ہارمونیم اور ستار بجانے والے کو دیکھا ہو گا۔ اس کی نظر کسی سمت ہو، خیالات غزل سرائی کی جانب متوجہ ہوں — یا سامعین کی طرف آنکھوں پہ پٹی بندھی ہو یا کھلی ہوں۔ انگلیاں اپنا کام اسی شان سے کرتی نظر آئیں گی۔ کیا مجال ہے جو کسی دوسرے تار یا پُر پر انگلی جا پڑے

مولانا کی نثر نگاری بھی کمال کے اسی مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچ چکی ہے، گردوپیش کے حالات اور خطرناک و سنگین حادثات بھی متاثر نہیں کر سکتے۔ خود "غبارِ خاطر" اسی کی آئینہ دار ہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء کا پُر آشوب زمانہ ہے۔ جرمنی سے سنہ ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑ چکی ہے۔ یہ جنگ فیصلہ کُن جنگ ہے۔ یورپ کے دو مختلف سیاسی اصولوں کی لڑائی ہے۔ آمریت اور نام نہاد جمہوریت کا سخت مقابلہ ہے۔ برطانیہ کو تباہی و بربادی کا منظر نظر آ رہا ہے۔ ہندوستان صدیوں سے برطانوی شہنشاہیت کا غلام ہے۔ پچاسی سال سے مسلسل جدوجہدِ آزادی جاری ہے۔ ہندوستان کی تمام آزادی خواہ جماعتوں نے اس جنگ کو

سرمایہ داری کی جنگ بتا کر باشندگان ملک کو الگ رہنے کی اپیل کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف آزادی کا وعدہ کئے بغیر جنگ میں نہیں گھسیٹا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ حکومت ایسے باغیانہ نعرے کو ایسے نازک حالات میں کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ مختلف جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ ان کے رہنماؤں اور سرگرم کارکنوں کو گرفتار کر کے لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ ۹ راگست ۴۲ء کی شب کو کانگرس کے سارے قائدین اچانک گرفتار کر لئے گئے۔ بمبئی کو ساری دنیا سے بے تعلق کر دیا گیا۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے گئے تاکہ باہر اطلاع نہ جا سکے۔ کانگرسی رہنماؤں کی اسپیشل سخت فوجی نگرانی میں ۸ بجے صبح کو کسی نامعلوم مقام کو روانہ ہو گئی۔ پورا ہندوستان امید و بیم کی حالت میں تھا۔ دونوں کی ضد نے ملک کو جہنم کدہ بنا دیا تھا۔ ان رہنماؤں کے متعلق یہ خیال ہو چلا تھا کہ بغاوت کا مقدمہ قائم کر کے پھانسی یا کم از کم عمر قید کی سزا ضرور ہوگی۔ خود رہنما بھی اپنے متعلق کسی طرح مطمئن نہ تھے۔

انہی اسیرانِ فرنگ میں طریقہ یوسفی کا تابع اور سنّتِ شعبِ ابی طالب کا متبع انڈین نیشنل کانگرس کا صدر اور آسمانِ علم و ادب کا بدر ابوالکلام آزاد بھی تھا۔ خود بیمار شریکِ حیات مسلسل گرفتارِ مرض و آزار اس پر پیہم شب بیداری اور ہجوم افکار قلعہ احمد نگر میں فوجی پہروں میں مقید و محبوس کر دیا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹوں کے بعد تھوڑا سا سکون ملنے پر نواب صاحب کو مخاطب بنا کر

"کس بشنود یا نہ شنود من گفتگوئے می کنم"

کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔

اب "غبارِ خاطر" کے ان خطوط پر نظر ڈالئے۔

قلعہ احمد نگر کی تاریخی حیثیت کا بیان ہو، یا گرفتاری کی روداد چینی چائے نوشی

کا پر سرور تذکرہ ہو یا اس کے ختم ہو جانے کا فسانۂ غم، شریک حیات کا نوحۂ ماتم ہو یا دردِ فراق کا قصہ الم، چڑے چڑیا کی کہانی ہو یا قلعہ کی شکستہ و کہنہ قبر کی داستان حسرت و ویرانی، گلہائے چمن کا ذکرِ زینت آرائی ہو یا بلبلان گلشن کی کیفیت نغمہ سرائی، خدا کی وحدانیت پر دلائل قاطعہ پیش کئے جا رہے ہوں۔ یا پھولوں کی خلقت پر براہین ساطعہ سب میں اعجاز نگاری کار فرما نظر آئیگی۔

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

وہ اہلِ علم حضرات جنہیں آزاد سیاسی مسلک سے اختلاف رہا ہے۔ جن میں مقتدر علماء اور محترم پروفیسران کا گروہ بھی شامل ہے۔ انہیں بھی "غبارِ خاطر" پر سر دھنتے دیکھا ہے۔ وہ بھی آزاد کی علمی قابلیت اور ادبی صلاحیت پر معتقدین و مخلصین کی طرح ایمان رکھتے ہیں۔ والفضل ماشھدت بہ الاعداء۔

وہ وقت بھی آ رہا ہے جب تاریخ بتائے گی۔ کہ یونان کا سقراط، حران کا ابن تیمیہ، افغانستان کا جمال الدین اور مصر کا محمد عبدہ اور جوہری طنطاوی، ہندوستان میں بھی ابوالکلام آزاد کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔

ماشئت قل فیہ فانت مصدق
والفضل یقضی والمحاسن تشھد

یا آسان طریقہ پر "با توچہ گویم کہ تو مجنوں نہ" کے اصول پر یوں سمجھئے۔

معشوق را بدیدہ عشاق بنگرید
حسن گلاں بہ چشم عنادل سپردہ اند

جس نے آزاد کو دیکھ پایا ہے، اسے یہی کہتے سنا ہے۔

"ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی آرزو ہے۔"

بقول مصحفی:- ترا شوق دیدار پیدا ہوا ہے
پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے

ہر ملاقات کے بعد خود اپنا یہ حال رہا ہے:-

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

۲۲ر ستمبر ۱۹۴۵ء سے ۲۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء تک ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ سیاسی ہنگاموں کی بنا پر مولانا کا قیام پھیر پھیر کر دہلی ہی رہا۔ چھ مرتبہ زیارت کا موقع ملا۔ خدا شاہد ہے دہلی تک شدرحال کا مقصد ملاقات کے سوا کچھ نہ تھا۔ تین ملاقاتوں میں تفصیل سے گفتگو کا موقع مل سکا اور تین میں ہجوم اشتغال کی بنا پر صرف سرسری سلام و دعا کی نوبت آسکی۔

۱۸ر جنوری ۱۹۴۶ء کو ۹ بجے صبح جناب عبدالمجید خواجہ بیرسٹر صدر آل انڈیا مسلم مجلس کے ساتھ حاضری ہوئی تو تقریباً پچاس موٹر اور بیسیوں تانگے کوٹھی کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ملاقاتیوں کا ہجوم کوٹھی کو گھیرے ہوئے تھا۔ یہ الیکشن کا زمانہ تھا۔ تمام صوبوں کا تاریخی انتخاب سامنے تھا اطلاع پہنچنے پر طلبی ہوئی۔ پنجاب کے ایک صاحب ریش بزرگ الیکشن کے مسئلہ پر بار بار سوالات کئے جا رہے تھے۔ نازک مزاجی متحمل نہ ہو سکی۔ عتاب کا انداز دیدنی تھا:ع

"بگڑنے پر بھی زلف اُس کی بلا کی"

اپنی خوش نصیبی پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے کہ خدا نے یہ رنگ بھی دکھا دیا۔

جی چاہتا ہے پھر انہیں اک دن خفا کریں
جی چاہتا ہے پھر انہیں دیکھیں عتاب میں

بلالی نے محبوب کے دونوں انداز کس خوبی سے دکھائے ہیں۔

گاہ آتش گاہ گل رخسارۂ جانانِ من
گل برائے دیگراں آتش برائے جانِ من

مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ کاش ان بزرگ کی بجائے غصہ میری قسمت میں آتا۔

دیکھ کر خندہ پیشانی سے حسبِ دستور سابق پیش آئے۔ مختصر صحبت رہی۔ میں نے خود جلد ہی اجازت حاصل کر لی اور واپس چلا آیا۔ فرصت ملنے پر خیال آیا اور حسبِ ذیل گرامی نامہ نے سرفراز فرمایا۔

دہلی۔ ۳۱ر جنوری ۴۶ء

عزیزی۔ آپ اس روز آئے اور میں اس درجہ مشغول و بے کیف تھا کہ کچھ دیر بیٹھ کر آپ سے باتیں بھی نہ کر سکا۔ اسے میرے تغافل پر محمول نہ کیجئے گا۔ آپ کی محبت و اخلاص کی وجہ سے میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں اور معاملہ رسوم و ظواہر سے گذر چکا ہے!

والسلام علیکم
ابوالکلام

سرفراز ناموں نے پہلے بھی مشرف فرمایا تھا مگر اس نامۂ گرامی نے بہت متاثر کیا۔ بے ساختہ زبان پر سرمد علیہ الرحمۃ کی رباعی یاد آگئی

ہر جا کہ روی مہر و وفا یار تو باد
آرام و فراغت ہمہ جا یار تو باد
از نامہ و پیغام فراموش مکن
یاد آوریم بکن خدا یار تو باد

۲۷ ستمبر ۴۵ء کی ملاقات کافی طویل رہی۔ لمبے اجلاسوں سے کچھ وقفہ ملا تھا کہ یہ میں بلائے ناگہانی بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہم نفس کی تلاش پہلے ہی سے تھی۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

علماء و صلحاء کا تذکرہ، تاریخی واقعات، علمی مشاہدات، عملی تجربات اور ادبی و فنی نکات کا دفتر کھل گیا۔ منہ سے پھول جھڑنے لگے۔

ہر غنچہ کہ گل گشت دگر غنچہ نہ گردد
قربان زلف یار کہ غنچہ گہے گل

یا یوں کہہ لیجئے:۔

تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے
غنچہ انداز مسکرانے کا

ادھر یہ عالم تھا:۔

ایک بجلی سی تڑپ جاتی تھی ہر جنبش کے ساتھ
درد بھی دل میں بہ اندازِ نگاہ یار تھا

گفتگو کا انداز، نگاہوں کی کیفیت، افہام و تفہیم کا طرز، کس کس چیز کا نقشہ کھینچوں، اور پھر!

گر مصور صورتِ آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

میں محوِ حیرت بنا ہوا سوچتا رہا:۔

ہر ایک عنوانِ دردِ فرقت ہے ابتدا شرحِ مدعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں اُن کو کہاں سے پہلے

پھر میں کہتا بھی تو کیا کہتا:۔

کب میری ہر نگاہ سے اُن پہ عیاں نہ تھا
وہ مدّعا جو تابعِ لفظ و بیاں نہ تھا

اور مجھے کچھ کہنے کی ضرورت بھی کب باقی رہی تھی؟ بقول غالب

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چوتھی ملاقات ۱۵ جون ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ وزارتی مشن سے روزانہ سابقہ گفت و شنید، ورکنگ کمیٹی کے بلا ناغہ اجلاس، اوقات فرصت کی قلّت، اشغال کی کثرت۔ ان تمام باتوں کے باوجود زیارت کی نوبت آئی، علمی و ادبی تذکرے چھڑے۔ والہ داغستانی، کے تذکرۂ ریاض الشعراء اور علّامہ فضل حق خیر آبادی کے رسالۂ روض المجود کی حیثیت کا بیان، مولانا معین الدین اجمیری مرحوم وغیرہ کا ذکرِ خیر، نواب صدر یار جنگ بہادر سے ملاقات، لکھنؤ کی کیفیت اسی قسم کی باتیں رہیں، کئی گھنٹوں تک ان ہی تذکروں سے مشامِ مجلس معطر اور بزمِ سخن منوّر رہی اور اپنا یہ حال رہا

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

پنڈت جواہر لال نہرو دو مرتبہ جھانک کر واپس گئے۔ پروفیسر رنگا جو یوپی سے کسانوں کی کانفرنس میں شرکت کر کے لوٹے تھے مشتاقِ ملاقات تھے۔ مولوی اجمل خان صاحب کی اجازت طلبی پر انتظار کا حکم ملا۔ شیخ حسام الدین بی۔ اے امرتسری صدر مجلس احرار اسلام ہند اور مسٹر ایس اے بخاری… ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو دہلی کی موجودگی بھی پُر لطف و باکیف گفتگو میں

خارج نہ ہوتی۔ گویا کچھ دیر کے لئے دوسرے ہی عالم میں پہنچ چکے تھے۔ ہنگامی دُنیا سے کوئی علاقہ ہی نہ رہا تھا۔ "غبارِ خاطر" کے دیباچہ میں اجمل صاحب نے کتنا صحیح لکھا ہے:-

مولانا کی سیاسی زندگی کے طوفانی حوادث ان کی تمام دوسری حیثیتوں پر چھا گئے ہیں، لیکن خود مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کو اپنے علمی اور ادبی علائق سے بالکل الگ رکھا ہے۔ ایک بے خبر آدمی اگر اس وقت کی باتوں کو سُنے تو خیال کرے کہ اس شخص کو سیاسی دنیا سے دُور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ اور علم و ادب کے سوا اور کسی ذوق سے آشنا نہیں۔ وہ اس وقت اپنی یکساں اور بے کیف سیاسی مشغولیت کا مزہ بدلنے کے لئے کوئی ایسا موضوع چھیڑ دیں گے جو سیاسی زندگی کے میدانوں سے ہزاروں کوس دُور ہوگا۔ علم و فن کا کوئی مبحث، فلسفیانہ غور و فکر کی کوئی کاوش، طبیعات کا کوئی نیا نظریہ، تصوف و اشراق کا کوئی وارده، یا پھر ادب و انشاء کی سخن طرازی اور شعر و سخن کی بزم آرائی، غرضیکہ سیاست کے سوا ہر ذوق کی وہاں گنجائش ہوگی، ہر وادی کی وہاں پیمائش کی جا سکے گی۔ اس وقت کوئی انہیں دیکھے تو صاف دکھائی دے کہ زبانِ حال سے خواجہ حافظ کا یہ شعر دُہرا رہے ہیں:-

کمندِ صید بہرامے بیفگن جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام است و نے گورش

مولوی اجمل خاں صاحب نے تو آٹھ سال کا تجربہ لکھا ہے اور مجھے زندگی کے چند خوش گوار لمحوں ہی نے اس کی تصدیق کرا دی۔ میں نے "غبارِ خاطر"

کا وہ نسخہ جس پہ نواب صاحب نے "ہدیۃً" اپنے دستخط اور میرا نام مزین فرما کر ازراہ قدر دانی مجھے عنایت فرمایا تھا، مولانا کی خدمت میں دستخطوں کے لئے پیش کیا، تاکہ دونوں بزرگوں کے دستخطوں کے بعد کچھ دن گذرنے پہ تاریخی اہمیت کی چیز ہو جائے۔ اور میرے کتب خانے میں بعض دوسرے نوادر کے ساتھ ایک جنس گراں مایہ کا اضافہ ہو سکے۔ اپنی مہربانی سے نہ صرف دستخط فرمائے بلکہ یہ شعر بھی سرورق پہ لکھ دیا۔

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

مولانا کی ساری زندگی مصرع ثانی کی حامل رہی۔ ابتداء ہی سے ترقی کے اعلیٰ مدارج پہ گامزن رہے۔ خیال کی بلندی اور فکر کی رفعت نے ہمیشہ مخلوق سے الگ شاہراہ بنوائی۔

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم
"کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"

پر کبھی دھیان ہی نہ دیا۔ غائبانہ کا کیا ذکر "شاہد لنہ" طور پر بھی کب محفوظ رہے۔ میں نے جگ بیتی کو چھوڑ کر آپ بیتی سرگذشت سنا ڈالی، حاشا خود ثنائی مقصود نہیں۔ مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مولانا کے اعلیٰ کردار اور بلند و بالا اخلاق سے روشناس کرا سکوں کہ جب میرے جیسے ہیچ مایہ انسان کے ساتھ یہ حسن سلوک ہے تو اہلِ فضل و کمال اور رفقائے قدیم سے وسعت اخلاق کا کیا حال ہوگا؟ اور مجھ جیسے ہیچ میرز کی حضوری پہ بڑی بڑی شخصیتوں کی موجودگی اثر انداز نہیں ہو سکتی اور التفات و شفقت میں خارج

نہیں بن سکتی تو کسی ہمدمِ دیرینہ کا مل جانا ملاقاتِ مسیحا و خضر سے بہتر کیوں نہ سمجھا جاتا ہوگا۔ اسی سے نواب صاحب موصوف کے خصوصی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ جو ہم ذوق ہونے کے علاوہ مولانا سے عمر میں تقریباً اتنے ہی بڑے ہیں۔ جتنا کہ میں مولانا سے چھوٹا ہوں۔ خوردوں پر شفقت ہی سے بزرگوں کی عظمت و توقیر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ:۔

"من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا" افصح فصحاء العرب کا ارشادِ گرامی ہے

یہ بھی عجیب اتفاق ہے اور زمانہ بخت و اتفاق سے بھرا پڑا ہے۔ خود بخت و اتفاق ایک معرکۃ الآرا مبحث ہے۔ فلاسفہ نے اس پر کافی طبع آزمائی کی ہے۔ خاتم الحکماء علامہ فضل حق خیر آبادی نے اپنی اہم ترین تصنیف حاشیۂ قاضی مبارک میں دوسرے مشہور مباحث کے ساتھ اس مبحث کو بھی مستقل طور پر لکھا ہے۔

۱۵ ؍ جون ۱۹۴۶ء کو چوتھی بار دہلی میں مولانا سے نیاز حاصل ہوا، جس کی مختصر کیفیت درج کی جاچکی ہے۔ یہی سال گذشتہ ۱۹۴۵ء کی وہ تاریخ تھی جس میں مولانا نے دوسرے رفقائے کار کے ساتھ قیدِ فرنگ سے نجات حاصل کی۔ اور یہی سال گذشتہ کی وہ تاریخ تھی جس میں میری مکمل تباہی و بربادی کی گئی تھی۔ اسی کو اتفاق کہتے ہیں۔ اس موقع پر بھی مولانا ہی کے تسکین دہ الفاظ نے زخمِ جگر مرہم کا کام دیا تھا۔ اور موصوف ہی کا اسوہ باعثِ تسکین ہوا تھا۔ بار بار کی گرفتاری و نظر بندی، سامان اور قیمتی ذخیرہ کتب کی بربادی، زوالِ صحت و تندرستی اور بزمانۂ اسارت شریکِ حیات کی دائمی جدائی، جب یہ نقشہ سامنے آگیا تو اپنا اچانک حادثہ جو اگرچہ سنگ آمد

دستِ آمد کا مصداق تھا، بھلا دینا پڑا۔ مصائب و تکالیف کی طاقت برداشت بھی اپنے اندر عجب کرشمہ رکھتی ہے۔ انسان کی ساری ترقیوں کا دارومدار اسی پر ہے۔ حدیث میں آتا ہے:۔

"اشد الناس بلاء الانبیاء"

اپنے مرتبہ کے لحاظ سے ہر نبی کو اس سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ حدیث میں یہ بھی آتا ہے:۔

ما اوذی نبی ما اوذیت

(میرے برابر کسی دوسرے نبی پر مصائب کے پہاڑ نہیں توڑے گئے) تیرہ سالہ مکی زندگی میں روحانی و جسمانی کون سی اذیت تھی جو مخالفین کے ہاتھوں نہ پہنچی ہے

"دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

گھر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔

جنوں میں عشق کے نکلے جو گھر سے
ادھر سے ہم چلے، پتھر ادھر سے

یہ مرتبۂ ابتلاؤ امتحان خوش نصیبوں ہی کو میسّر آتا ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ بہادری کسی پر حملہ آور ہو جانے میں نہیں، بلکہ غصّہ کے ضبط کرنے اور اذیّت برداشت کرنے میں ہے۔" مولانا نے نے بھی سب کچھ برداشت کیا۔ اُسوۂ حسنہ کی وہ کون سی پیروی ہے، جو تھوڑی بہت نہ کی، گالیاں کھائیں، پتھر کھائے، اپنوں کے طعنے، غیروں

کے بچے کے سہے، قید و نظر بندی کی زندگی گذاری، سامان و املاک کی تباہی دیکھی اور اس سب کے باوجود

"اللھم اھد قومی فانہم لا یعلمون"

کی دُعائے خیر کے سوا حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ ایک لفظ بھی اپنی مدافعت و صفائی میں نہ کہا۔ کہنے والے کو ہمیشہ فراخ حوصلگی سے معاف کیا۔ سدا کوہِ وقار اور پیکرِ استقامت بنے رہے۔ ملک الشعراء ابوطالب کلیم ہمدانی نے شاید مولانا ہی کے لئے کہا تھا۔

دشنام خلق را نہ دہم جز دُعا جواب
ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم

حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت قرآن مجید نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:۔

"یا بنیّ اقم الصلوٰۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر والصبر علی ما اصابک ان ذالک من عزم الامور"

(اے بیٹے، اسر چشمۂ خیر، نماز کی پابندی رکھنا، بھلائیوں کا حکم اور بُرائیوں سے منع کرتے رہنا۔ اس فرض کی انجام دہی میں غفلت نہ برتنا، اس سلسلہ میں تمہیں جو مصیبتیں پہنچیں، انہیں برداشت کرنا یہ باتیں بڑی ہی اہمیت رکھتی ہیں!)

مولانا ہر ایسے موقع پر صبر و استقامت سے یہ شعر پڑھتے نظر آئے۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے مافوق الفطرت انسان روز پیدا نہیں ہوتے۔

صدیوں میں کسی ملک کی خوش نصیبی میں اضافہ کیا کرتے ہیں۔

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات

تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

بخت و اتفاق کے سلسلے میں بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اسی اتفاق کے دو ایک واقعے جو دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے، اور سنتے چلیے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ بیت المقدس پر خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی کے عہد میمنت مہد سے اسلامی جھنڈا لہرا رہا تھا، ۱۰۹۹ء میں عیسائیوں نے اس پر تسلط قائم کر لیا۔ گوڈ فرے اور ٹنکر واس میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں تقریباً ۹۰ برس کے بعد پھر علمِ اسلامی لہرا دیا ہندوستان پر بھی اسی عیسائی قوم نے مکمل طور پر ۱۸۵۷ء میں قبضہ کیا۔ یہاں بھی فلسطین کی طرح صدیوں سے مسلمان ہی حکمران تھے۔ آئندہ سال ۱۹۴۷ء میں ۹۰ برس ہو جائیں گے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ بیت المقدس کی طرح یہ بدقسمت ملک بھی غیروں کی غلامی سے اسی میعاد کے اندر نجات پا جائے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ!

اسی اتفاق کی ایک کڑی یہ بھی ہے، کہ جس دن سلطان نے فلسطین فتح کیا ہے ۲۷ رجب ۵۸۳ھ تاریخ تھی۔ سلطان نے نمازِ شکر اسی مسجد اقصیٰ میں ادا کی جس میں ۶۰۰ سال قبل شبِ معراج کو اسی تاریخ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے امامتِ انبیاء کرام فرمائی تھی۔ کیا اس طرح سلطان نے "الصلوٰۃ معراج المومنین" کا رتبہ حاصل نہ کر لیا۔

اسی قسم کا اتفاق ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کی تاریخ کو بھی سمجھیے۔ میری تباہی، مولانا کی رہائی۔ اور پھر دوسرے سال اسی تاریخ میں یک جائی و بزم آرائی۔ فکر کی رسائی بھی کیا چیز ہے۔ کبھی کبھی آسمان سے تارے بھی توڑ لاتی ہے اتفاق

ہے اور کیسا یہ لطف اتفاق۔ مولانا کی عمر قمری حساب سے پورے ۶۰ سال کی ہے۔ ۱۳۰۵ھ میں مکہ معظمہ میں ولادت باسعادت ہوئی، "غبار خاطر" اور "کاروان خیال" ۶۵ھ میں شائع ہوئیں۔ آخر الذکر میں ۶۵ھ کا مکتوب بھی شامل ہے۔ پورے ۳۰ سال قبل، جب کہ آفتاب عمر نصف النہار پہ پہنچا ہوا تھا، مولانا کی خود نوشت سوانح عمری ۱۳۳۵ھ میں تذکرہ کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ مرزا افضل الدین احمد کے اصرار سے مولانا نے اپنے بزرگوں کے حالات لکھے تھے۔ اصرار شدید پہ کچھ اپنا حال بھی لکھنا پڑا۔ اب تذکرہ نایاب ہوگیا ہے۔ جن حضرات کے پاس ہے، وہ حرز جان بنائے ہوئے ہیں اور کسی قیمت پہ علیحدہ کرنے کو تیار نہیں۔ بس اپنے دعوی کی دلیل پہ تھوڑا سا اقتباس پیش کروں گا۔ میں نے دعوی کیا تھا کہ مولانا کے مضامین وخطوط میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ کہ ایک سے دوسری عبارت کا درجہ بڑھا ہوا ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس کو کس پہ ترجیح دی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں مجموعہ خطوط آپ کے سامنے ہیں۔ اب پورے تیس سال قبل کی عبارت ملاحظہ ہو۔

در مجلس وصالش خمہا کشید مرداں
چوں دور خسرو آمد مے در سبو نماند

بہ غریب الدیار عہد ناآشنائے عصر، بیگانہ خویش ونمک پروردہ ریش معمورۂ تمنا وخرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد ومدعو بابی الکلام ہے، ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے عدم ہستی نمامیں وارد ہوا۔ اور تہمت حیات سے متہم! الناس نیام اذا ماتوا فانتبھوا

شورے شدہ از خواب عدم چشم کشودیم
دیدم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے فیروز بخت تاریخی نام رکھا تھا۔ اور مصرع ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا۔ ۱۳۰۵ھ

"جواں بخت و جواں طالع جواں باد"

سبحان اللہ! بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمہ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی۔ نیمہ عمر جو شاید باقی ہے، دم لینے اور سستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزل مقصود کا پتہ ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم۔ جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی و منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا۔ اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی۔ نہ ہمت میں کارفرمائی، تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ لی، راہ دور، اور نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سروسامان کا ناپید، وقت جا چکا۔ اور ہر آن و ہر لمحہ کاروانِ مقصود سے دوری اور منزل مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس مل جائے پھر بھی وہ دولتِ وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لٹ چکی؟ اور وہ قافلہ امید کب پس ماندگانِ غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا؟

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ساری فیروز بختی و جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے "یَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَ تَسْوَدُّ وُجُوهٌ" اصلی فیروزمندی وہاں کی فیروزمندی ہے۔ اور جواں بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پورا اترے......

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے۔ سلام علی نجد و من حل بالنجد!

رنجد اور نجد کے نازلین پر سلام و رحمت نازل ہو، مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ و دار الہجرۃ سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے۔ قبلۂ عبادت گذاران عشق و کعبۂ نیازمندان شوق، علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ!

دارم دل گرداں کہ من قبلہ نما می خوانمش
رو سوئے ابرو لیش کند ہر چند می گردانمش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہیئے کہ بحکم کن فی الدنیا فانك غریب" ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر، تمام مسافران ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپار، سب کو ایک ہی مستقر و موطن درپیش، البتہ کسی کے لئے ساءت مستقراً و مقاماً میں داخل اور کسی خوش نصیب کے لئے حسنت مستقراً و مقاماً

وابرح ما یکون الشوق یوماً
اذا دنت الخیام من الخیام

مولد و منشاء طفولیت" وادی غیر ذی زرع عند بیت اللہ المحرم ہے۔ یعنی مکہ معظمہ، زاداللہ شرفاً وکرامتہ" محلہ قدوۃ متصل باب السلام۔

بلاد بها نیطت علیَّ تمائمی
واول ارض مس جلدی ترابها

ل یہ وہ دیار ہے جہاں میری گردن میں تعویذ ڈالے گئے، یعنی جہاں بچپن کا زمانہ گذرا ہے۔ اور یہی وہ زمین ہے جس کی خاک نے سب سے پہلے

باقی بر صہ ۲۸

اس وقت کہ ۱۳۳۵ھ قریب الاختتام ہے، قافلہ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا۔

یقولون ھل بعد الثلاثین ملعبًا

فقلت، وھل قبل الثلاثین ملعبًا

"لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا تیس سال کے بعد بھی کھیل کود کا موقع ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کیا تیس سال سے پہلے بھی کوئی کھیل کھیلا جا سکتا ہے؟" قریب ہے کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں۔

کس نمی گوید از منزل آخر خبرے ۔۔۔ صد بیاباں بگذشت و دگرے درپیش است

آپ نے اتفاق ملاحظہ کیا۔ ۱۳۰۵ھ کی پیدائش، ۱۳۳۵ھ میں اشاعت تذکرہ اور ۱۳۶۵ھ میں اشاعت مجموعہ مکاتیب "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" لگے ہاتھوں یہ اتفاق بھی ملاحظہ کرتے چلئے کہ پہلا خط ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء کو لکھا گیا تھا۔ اور آخری خط ۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو۔ اس مجموعہ کا آخری خط

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷)

میرا بدن مس کیا ہے۔ یہ شعر رقاع بن قیس الاسدی کا ہے اس کے ساتھ کے دو اشعار یہ ہیں:۔

احب بلاد اللہ ما بین منعج ۔۔۔ الیّ وسلمیٰ ان یصوب سحابہا

الم تعلمی یا دار ملحاء انہ ۔۔۔ اذا اجدبت او کان خصبا جنابہا

معجم البلدان میں تمت کے بجائے ینطت کا لفظ ہے اور مقدمہ مطول میں شعر یوں درج ہے:۔

دیار بہا حل الشباب تمیمتی

فاول ارض مس جلدی ترابہا

۱۱ مئی کی رسید وصول مکتوب کو چھوڑ کر ۴ ستمبر ۴۵ء ہی کا ہے۔ التفاقات کو کہاں تک لکھا جائے۔ یہ تو صرف وہ چند التفاقات تھے جو اس مجموعہ اور اس کے متعلقین سے وابستہ ہیں۔ چونکہ فلسطین و ہندوستان کی صورت حالات یکساں تھی اور جدوجہد آزادی کے تقریباً نصف صدی سے مولانا رُکن رکین تھے۔ اس لئے اس کا بھی ذکر آگیا۔ بڑے لوگوں میں ایسے خوش نصیب کم ہوتے ہیں جن کی سوانح عمریاں ان کی زندگی میں مرتب ہو جائیں۔ اس معاملہ میں مولانا خوش نصیب ہیں۔ انگریزی اور اُردو میں مختلف لکھنے والوں نے اپنے ذوق کے مطابق حالات مرتب کئے ہیں۔ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں تذکرہ شائع ہوا تھا۔ دو سوانح عمریاں صدارت انڈین نیشنل کانگریس بہ اجلاس رام گڑھ ۱۹۳۹ء میں لکھی گئیں، مسٹر مہادیو ڈیسائی نے کافی صفحات کی کتاب حالات میں لکھ ڈالی جو یورپ میں بھی کافی مقبول ہوئی۔ ابھی حال میں کئی سو صفحے کی سوانح حیات مسٹر راجپوت ایم۔ اے کی لکھی ہوئی انگریزی میں سامنے آئی۔ مولانا پر بے شمار مقالہ نگاروں میں چوٹی کے رہنما اور صف کے مشاہیر اہل قلم، علامہ سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، مسٹر آصف علی، چراغ حسن حسرت، یوسف مہر علی، مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی، نصر اللہ خاں عزیز، مسٹر مہادیو ڈیسائی، پنڈت جواہر لال نہرو، اور مسٹر جان گنتھر کے نام سے بھی نظر آتے ہیں۔ عبداللہ بٹ نے مقالوں کا مجموعہ بھی شائع کیا ہے اور مختصر حالات علیحدہ بھی لکھے ہیں۔ ایسا بھی کم ہوتا ہے کہ بڑا آدمی خاندان و حسب نسب کے اعتبار سے بھی بڑا ہوا۔ ہمارے یہ دونوں بزرگ اس سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہیں۔

خاندانی عزت و وجاہت، نسبی نجابت و شرافت اور حسبی علو و رفعت سے بھی مالا مال ہیں۔ ایک اگر نامور شروانی قوم کا فخر خاندان فرد ہے۔ تو دوسرا صدیقی نسل کا چمکتا ہوا چراغ اور خاندانِ علماء صلحاء کا بدرِ منیر۔ ایک کے اجدادِ کرام نسلاً بعد نسلٍ امارت و ریاست سے بہرہ ور رہے ہیں — تو دوسرے کے آباء عظام مسند آراء علم و معرفت   ایک مورث اعلیٰ عمر خاں شروانی وغیرہ، وزراء و امراء سلطنت ہند ہوئے ہیں — تو دوسرے کے اسلاف قاضی القضاۃ، مفتیٔ اعظم اور رکن المدرسین کے عہدۂ جلیلہ پر سرفراز۔

یہ شرف و عزت اضافی ہے۔ اس پر فخر و غرور عالی ظرفوں کا کام نہیں۔ یہ اختیاری کب ہے اور غیر اختیاری پر فخر و غرور کیسا؟ عرفی نے کیا خوب کہا ہے۔

اما نبود وصفِ اضافی ہنر ذات
این فتوئ ہمت بود ارباب ہمم را
این برق نجابت کہ جہد از گوہر من
طرح است وسے گوہر ذاتِ اب و عم را
وصفِ گل و ریحاں بہ ہوا باز نہ گردد
ہر چند ہوا عطر دہد قوتِ شم را
المنۃ للہ کہ نیازم بہ نسب نیست
اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را

یہ وہی عرفی شیرازی ہیں جن کی عمر بھر کی کمائی، یعنی مکمل و مرتب دیوان ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گر گیا، کشتی میں بیٹھے کہیں جا رہے تھے۔ صدمہ ہوا اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا اور برجستہ یہ شعر کہا۔

گفتہ گر شد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجاست
از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

یہ ہے اصل نجابت شرافت۔ اب جو کچھ کلام ہے۔ یہ اس کے بعد کا کہا ہوا ہے۔ اسی لئے نادر شاہ نے استفساراتِ نسب نامہ کے موقع پر اپنے آپ کو شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر کہا تھا۔ خود مولانا نے تذکرہ کے ابتدائی اوراق میں اس پر کافی لکھا ہے۔ اسلاف کرام کے حالاتِ فضل و کمال لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

انسان کے لئے معیارِ شرافت جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں۔ نہ یہ کہ اپنی عزت کے لئے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں۔ اربابِ ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے۔ اور اپنی رفعت و عظمت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے۔ جو خود اُن کا اپنا بنایا ہوا تھا۔ نپولین کا ایک قول مجھے نہیں بھولتا۔ فتح پروشیا کے بعد جب فریڈرک اعظم کی قبر پہ گیا۔ تو دیکھا کہ فریڈرک کی تلوار قبر پہ لٹک رہی ہے۔ نپولین نے تلوار اُتار کر ایک ساتھی کے حوالے کی اور کہا کہ پیرس کے عجائب خانہ کی نذر کر دوں گا۔ یہ سُنکر ایک جنرل نے کہا "اگر مجھ کو ایسی با عظمت اور تاریخی تلوار ملتی تو کبھی کسی دوسرے کو نہ دیتا"۔ نپولین نے کہا "کیا میرے پاس میری تلوار نہیں ہے؟" خاندان کے فخر کا بُت بھی عہد جاہلیت کی ایک مشئوم یادگار ہے اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اس بُت کو بھی توڑ دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ کل کو ایک نو مُسلم چمار اپنے حُسنِ عمل سے وہ

مرتبہ پائے جو شیخ الاسلاموں کی اولاد کو نصیب نہ ہو۔ یہ کل کو ہونے والی بات ہے اور آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ "عمل" کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا رہتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے ؂

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

مولانا کے متعلق اس سے زیادہ کیا لکھوں؛۔

گوہرے کز دو کون بیروں است

می تواں یافت در خزانۂ ما

نواب صاحب کے متعلق مجلہ "مصنّف علی گڑھ" جنوری ۱۹۴۶ء میں لکھ ہی چکا ہوں۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُن کی

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

جا کر ملیے اجی خوش ہو جائے۔ بزرگوں کی حکایتیں، اسلاف کی داستانیں، صحابہ کرام کے حالات، اُسوۂ حسنہ کی تعلیمات، لسان الغیب، حافظ کے دیوان کے اشعار، یہی مجلس کی گفتگو میں اور یہی محفل کی باتیں۔ متعنا اللہ بطول بقائہٖ۔

شروانی خاندان میں نواب صاحب سے بڑھ چڑھ کر بعض صاحب ثروت وریاست بزرگ گذرے ہیں، علم وعمل کے لحاظ سے بھی بعض ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، مصنّف ومؤلّف بھی ہوئے ہیں۔ لیکن یہ علم وعمل اور فضل وکمال کسی دوسرے کو حاصل نہ تھا۔ بلاخوف لومۃ لائم کہا جا سکتا ہے کہ پوری نسل میں ایسی جامع صفات ہستی آج تک نہیں گذری۔ یہی وجہ تھی۔ کہ سرکار نظام کی نظر توجہ اپنے استاد نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان

کی وفات کے بعد ان پر پڑی اور ۱۳۳۶ھ میں صدارت و امارتِ شرعیہ کے عہدہ پر سرفراز فرمایا۔ صدر الصدور کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں نواب صدر یار جنگ بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۳ سال تک یہ خدمت انجام دے کر پیرانہ سالی کی بنا پر مارچ ۱۹۳۰ء میں سبکدوشی حاصل کر لی۔ ہندوستان کے تمام مشہور اداروں کے رُکن و عہدہ دار ہیں۔ اب اپنے کتاب خانہ حبیب گنج ضلع علیگڑھ کی نادر الوجود کتابوں کے مطالعہ میں وقت صرف کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کا تدبّر و تفکّر، علم و ادب تقریر و تحریر اور فضل و کمال بدوِ شعور ہی سے وجہ کشش رہا۔ علمی تبحّر کے ساتھ سیاسی جدو جہد اور ایثار و قربانی نے اعتقاد کا درجہ عطا کر دیا۔

دین و دل ربود از من جنبش دو ابرو یش
دو چشمِ مست او برد ہوشیاری ہا

اپنی نا اہلی کا پورا اعتراف ہے۔ دونوں با کمال بزرگوں کی فرطِ عقیدت نے یہ سطریں قلم سے نکلوا دی ہیں۔ اور میں فخر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ــــ "کاروانِ خیال" کے دیباچہ لکھنے کا شرف نصیب ہو رہا ہے۔

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

مکاتیب کے متعلق میں نے کچھ نہ لکھنے کے برابر لکھا ہے۔

مشک آں است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ البتہ مولانا کے خطوط میں لکھے ہوئے عربی اشعار کا بالترتیب ترجمہ و مطلب اور ضروری معلومات کا آخر میں درج ناگزیر ہے۔ تاکہ عربی سے ناواقف حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھا لیں۔

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیس و لم یسمر بمکۃ سامر

گویا حجون[1] سے لے کر صفا[2] تک نہ تو کوئی انیس و ہمدم رہا اور نہ مکہ ہی میں کوئی رات کا ہم جلیس و ہم صحبت قصہ گو باقی رہا۔

یہ عمرو الخزاعی کا شعر ہے۔ قریش سے پہلے قبیلۂ خزاعہ ہی سکان حرم اور خدام کعبہ تھے۔ شاعر نے فراق مکہ اور خزاعہ کی جدائی خانۂ کعبہ پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اشعار کہے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک شعر یہ بھی ہے:

۲- وحدثنی یا سعد عنہا فزدتنی
جنوباً فزدنی من حدیثک یا سعد

اے سعد! تو نے محبوبہ کا ذکر چھیڑ کر میرے جنون میں اضافہ کر دیا۔ مہربانی کر کے اپنی گفتگو دراز کر (تاکہ میرا جنون بھی بڑھتا چلا جائے)

۳- عیون المھیٰ بین الرصافۃ والجسر[3]
جلبن الھویٰ من حیث ادری ولا ادری

رصافہ اور جسر کے درمیان رہنے والی جنگلی گایوں کی نشیلی آنکھوں نے محبت کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ علی بن الجہم کے مطلع کا ایک مصرع درج مکتوت کیا گیا ہے۔

۴- اقول الصاحبی والعیس تھوی
بنا بین المنیفۃ فی الضمار

---

[1] حجون پہاڑ ہے اسفل مکہ میں [2] کوہ صفا مشہور و معروف ہے
[3] جسر پل کو کہتے ہیں۔ بغداد کا پل مراد ہے

تمتع من شميم عرار نجد
فما بعد العشية من عرار
شهور ينقضين وما شعرنا
بانصاف لهن ولا سرار
فاما ليلهن فخير ليل
واطيب ما يكون من النهار

میں نے اپنے ساتھی سے کہا جب کہ اونٹ چشمہ بنو تمیم، منیفہ اور ضمار (گاؤں) کے درمیان ہمیں لئے ہوئے تیزی سے چل رہے تھے نرگس نجد کی خوشبو سے فائدہ اٹھا لے۔ آج کی شب کے بعد پھر اس کا میسّر آنا مشکل ہے۔

یہ عیش و طرب اور خوش وقتی کے ایسے مبارک مہینے ہیں کہ گزرے چلے جارہے ہیں۔ اور ہمیں ان کے نصف اور خاتمہ کا پتہ بھی نہیں چلتا یعنی عیش کے دن چونکہ جلدی گذرتے ہیں اور انسان عیش و آرام و غفلت میں سرشار رہتا ہے۔ اس لئے اسے وقت گذرنے کا علم بھی نہیں ہوتا۔ لہذا ہمیں بھی اوقات کا پتہ نہ چل سکا۔

ان مہینوں کی راتیں بہترین راتیں ہیں اور دن بھی بڑے خوشگوار ہیں۔ الطیب کی جگہ اقصر کا لفظ نظر پڑا۔ "واقصر ما یکون من النہار"۔ یعنی ان مہینوں کے دن کس قدر چھوٹے ہیں۔ راحت کے دن چھوٹے اور کم ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مصیبت کی گھڑیاں ہی کاٹے نہیں کٹا کرتیں۔

مولانا نے اوّل و آخر کے چار اشعار نقل کئے ہیں۔ دو شعر درمیان میں رہ گئے ہیں۔ وہ بھی سن لیجئے۔ حماسہ وغیرہ میں شاعر کا نام ہی نہیں

دیا گیا۔

صاحب معاہدۃ التنصیص شرح شواہد التلخیص نے ان اشعار کو الصمۃ القشیری کی طرف منسوب کیا ہے اور قیل کہہ کر جعدہ بن معاویہ کا قول بھی نقل کر دیا ہے۔ درمیانی اشعار یہ ہیں:۔

الا یا حبذا نفحات نجد
وریا روضۃ بعد القطار
واھلک اذ یحل الحی نجداً
وانت علی زمانک غیر زار

نجد کی خوشبوئیں اور اس کے باغیچوں کی بارش کے بعد ترو تازگی کیسی دل فریب وخوشگوار ہے۔

نجد کے رہنے والے محبت کئے جانے کے قابل ہیں یہاں آنے کے بعد انسان اپنے زمانے کا شاکی نہیں ہوتا۔ یعنی دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر مسرت وشادمانی سے زندگی گذارتا ہے۔

قلبی یحدثنی بانک متلفی
روحی فداک عرفت ام لم تعرف

میرا دل مجھے بتا رہا ہے کہ تو مجھے ہلاک کرنے والا ہے میری جان تجھ پر فدا ہو، خواہ تجھے اس کا علم ہو یا نہ ہو۔

شرف الدین ابو حفص عمر ابن الفارض المتوفی ۶۳۲ھ کے ۵۱ اشعار کے قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں بڑے پایہ کے بزرگ وادیب گذرے ہیں۔ کلام کا اکثر حصہ معرفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ بنظر غور سے دیکھا جائے تو یہ مطلع اور سارا قصیدہ بھی معرفت میں ہے دوسرا شعر یہ ہے

لم اقض ھواک ان کنت الذی
لم اقض فیہ اسیٰ مثلی من یفی

تیری محبت کا حق ادا نہ کر سکوں گا۔ اگر تیرے غم میں جان نہ دے سکا اور میرے جیسا باوفا عاشق وفاء عہد ہی کرے گا۔

یہ بزرگ سلطان محمد کے زمانے میں گذرے ہیں۔ سلطان کو علم وادب اور شعراء وادباء سے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک مجلس میں سلطان نے کہا کہ سب سے دشوار قافیہ کے اشعار پڑھے جائیں۔ بحث کے بعد مشکل ترین قافیہ یائے ساکن کا مانا گیا۔ شعراء دربار نے اشعار سنانا شروع کئے۔ آٹھ دس اشعار سے زیادہ کوئی نہ سنا سکا۔ آخر میں سلطان نے پورے پچاس اشعار کا اس قافیہ میں قصیدہ سنایا۔ قاضی شرف الدین نے آخر میں عرض کیا۔ کہ میں ڈیڑھ سو اشعار کا ایک ہی قصیدہ سناتا ہوں اور یہ کہہ کر

سائق الاظعان یطوی البید طی
منعمان عرّج علیٰ کثبان طی

پورا قصیدہ سنایا۔ سلطان نے اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا۔ میرے کتاب خانہ میں شعراء جاہلیت واسلام کے دواوین بھرے پڑے ہیں پوری تلاش کے بعد میں پچاس اشعار سے زیادہ پر واقفیت حاصل نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ تم نے کہاں سے حاصل کیا۔ اور اس کا کہنے والا کون باکمال و قابلِ قدر شخص ہے؟ قاضی صاحب نے علامہ ابن الفارض کا نام و مقام بتایا۔۔۔ سلطان مشتاق ملاقات ہو کر قاہرہ پہنچا۔ قاضی صاحب کو ایک ہزار دینار نذر کے لئے دے کر کہا کہ ہماری طرف سے پیش کر کے کہنا کہ:۔

"تمہارے سعادت مند محمد نے سلام عرض کیا ہے اور تمنائے

ملاقات ظاہر کی ہے۔"

قاضی صاحب نے عذر پیش کیا کہ نہ تو ابن الفارض اس نذر کو قبول کریں گے اور نہ ہی اس پیغام رسانی کے بعد مجھے حاضر دربار ہونے دیں گے سلطان کے اصرار پر مجبوراً جانا پڑا۔ جب حرفِ مطلب ادا کیا گیا۔ تو ایک سال کے لئے اپنے یہاں آنے کی بندش کرتے ہوئے مجلس سے اٹھادیا۔ سلطان نے حسرت سے کہا کہ میرے زمانے میں ایسی ہستی موجود ہو، اور میں زیارت سے محروم رہوں۔

ایک روز اپنے چند مصاحبین کو لے کر پہنچ ہی تو گئے۔ علّامہ کو پتہ چلا تو دوسرے دروازے سے نکل کر اسکندریہ چلے گئے اور زمانۂ دراز تک وہیں رہے۔ دیکھا آپ نے اہل سطوت وثروت کی مردم شناسی وقدردانی اور صلحاء علماء اور اہل کمال کا استغنا وروگردانی!

وابرح مایکون الشوق یوماً

اذا دنت الخیام من الخیام

جس روز محبوب کے خیموں سے حبیب کے خیمے قریب ہوں گے۔ اس روز شوق کا کیا عالم ہوگا؟

فارسی شاعر نے بھی اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک　　آتشِ شوق تیز تر گردد

تزئین الاسواق میں ابرح کے بجائے اعظم کا لفظ ہے۔ معنی میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔

۷　ولیس اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی الواحد

اللہ کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں کہ سارے عالم کو ایک ذات میں جمع کردے۔ یعنی ایک شخص کو بہت سے کمالات عطا فرما دے۔

یہ شعر ابونواس المتوفی ۱۹۹ھ کے ان چھ اشعار میں سے ایک ہے، جو خلیفہ ہارون رشید کو فضل بن ربیع کی تعریف میں لکھ کر پیش کئے گئے تھے۔ اس سے اُوپر کے دو شعر یہ ہیں:۔

انت علی ما بك من قدرة
فلست مثل الفضل بالواجد
اوحده الله فما مثله
لطالب ذاك ولا ناشد

خلیفہ کو مخاطب کر کے شاعر کہتا ہے کہ اپنی تمام دولت و ثروت قدرت و سطوت کے باوجود فضل بن ربیع جیسا دوسرا کامل نہیں پا سکتا۔ اللہ نے اُسے یگانہ و یکتا بنایا ہے۔ طلب و تلاش کے باوجود اس جیسا دوسرا نہیں مل سکتا!

پہلے شعر کا پہلا مصرع یوں بھی بعض مقامات پر دیکھا:۔

ولیس علی الله بمستنکر

اسی شعر کے ہم معنی ابن قلاقس نے بھی شعر کہا ہے:۔

وقد جمع الله فيك الانام
وليس عليه بمستنكر

اللہ نے تیری ذات میں سب خلق جمع کر دی ہے اور یہ سب کچھ اس پر دشوار نہیں۔ ومن بعد هذا ما يدق بيانه
وما كتمه احظى لديه واجمل

اس تمام روداد غم کے بعد ایک بات ایسی بھی ہے جس کا بیان حد درجہ دشوار اور اس کا پردہ خفا میں رہنا زیادہ پسندیدہ و مستحسن ہے۔

۹۔ قليل منك يكفيني ولكن
قليلك لا يقال لہٗ قليل

تیری جانب سے تھوڑی بات بھی میرے لئے بہت کافی ہے کیونکہ تیرے تھوڑے کو تھوڑا ہی کہا نہیں جا سکتا۔

ایک دوسرے شاعر نے اسی مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ اور حبیب کے لفظ نے اس موقع کے مناسب کتنا لطف پیدا کر دیا ہے

لا تحقرن قليل من احبته
ان القليل من الحبيب كثير

اپنے محبوب کی کم توجہی کو کم نہ سمجھ، دوست کا تھوڑا بھی بہت ہوتا ہے۔

أليس قليلاً نظرة ان نظرتها
اليك وكلا ليس منك قليل

میرا تیری طرف ایک نظر دیکھ لینا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن تیری ایک نظر اے محبوبہ! کم نہیں کہی جا سکتی۔

ابو معاذ نے بخیل کی تعریف میں یہی مضمون ادا کیا ہے:۔

فاذا اقل لی البخيل عذرته
ان القليل من البخيل كثير

بخیل کا تھوڑا دینا ملامت کا مستحق نہیں، اسے معذور سمجھنا چاہئے، کیونکہ بخیل کا تھوڑا بھی بہت کا حکم رکھتا ہے۔

اسحٰق بن ابراہیم الموصلی کہتا ہے:۔

ان ماقل منک یکثر عندی

وکثیر ممن تحب القلیل

اے محبوبہ! تیری تھوڑی سی نگہ التفات میرے نزدیک خزانۂ بیکراں کا حکم رکھتی ہے۔۔ اور تیرے حبیب کا تیری طرف ہر وقت متوجہ رہنا بھی کم ہی سمجھا جائے گا۔ دوسرے مصرع کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ کہ جسے تم محبوب رکھتے ہو، اُس کی تھوڑی توجہ بھی بہت ہوتی ہے۔

۱۰۔ کیف الوصول الی سعاد ودونہا

قلل الجبال و بینھن خیوف

سعاد تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کی راہ میں پہاڑوں کی چوٹیاں اور اُن کی گھاٹیاں حائل ہیں۔

مولانا نے ۲۰ جون سنہ ۱۹۴۲ء کے مکتوب سامی میں انند رام مخلص کی کتاب مرأۃ المصطلحات کے متعلق دریافت کیا ہے۔ اس کا جواب شامل مکاتیب نہیں ہے۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ نہ کتاب خانہ حبیب گنج میں ہے نہ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں۔ لٹن لائبریری میں "حالاتِ عہد محمد شاہ بادشاہ غازی" خود مخلص ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ آخر میں ناقص ہے۔ ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۱۶۰ھ کی لکھی ہوئی ہے محمود افغان حارس قندھار و مستلطِ ایران کے حالات سے ابتدا ہوتی ہے اور با بادر کا ہی درویش اوداسے کے احوال پر اختتام۔ اس کے جلیس و ہم صحبت سراج الدین علی خاں آرزو اور شمس الدین فقیر بھی صاحب تصانیف اور فاضلانِ عہد میں سے ہیں۔

سراج الدین علی خان آرزو کی مصنفات تصحیح[۱] غرائب اللغات موہبت[۲] عظمیٰ (معانی و بیان) اور عطیۂ[۳] کبریٰ (عروض) محررہ سنہ ۱۲۱۵ھ و سنہ ۱۲۳۵ھ اور میر شمس الدین فقیر کی تصانیف خلاصۃ البدیع اور تذکرہ شعراء محررہ سنہ ۱۲۶۳ھ بقلم میر نواب مونس بھی لٹن لائبریری میں محفوظ ہیں۔ مرأۃ المصطلحات غالباً طبع نہیں ہوئی۔ اس کا کوئی نسخہ نظر سے نہیں گذرا۔

محمد عبد الشاہد خاں شروانی
اورینٹلسٹ لٹن لائبریری، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

بیت المصنف
کانفرنس کمپاؤنڈ، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
۱۶/ ذی قعدہ سنہ ۱۳۶۵ھ، مطابق ۱۲/ اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء

۱۹ - اے، بالی گنج - سرکلر روڈ، کلکتہ
۴م ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء

صدیقی العزیز
آج الماریوں میں ایک کتاب ڈھونڈھ رہا تھا۔ اتفاقاً ایک مجلد پہ نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو ارشاد الملاء وغیرہ ندوہ کے بعض رسائل کا مجموعہ تھا۔ اِس مجموعہ کو دیکھتے ہی ذہن ندوہ کی صحبتوں کی طرف منتقل ہوا۔ اور پھر اچانک آپ یاد آگئے۔

قاصدے کو کہ فرستم بہ تو پیغامے چند

بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملاقات ہوتی۔ افکار زمانہ اور کاوش ہائے روزگار سے الگ ہو کر دو گھڑی بیٹھتے اور پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کرتے جام و مینا کا دور نہ سہی، چائے کے پیالہ ہائے پیہم کیا کم ہیں ؎

زخیل درد کشاں غیر ما نماند کسے
بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

مڑ کے دیکھتا ہوں تو گذری ہوئی صحبتیں ایک ایک کرکے سامنے آتی ہیں۔ اور کچھ دیر کے لئے ایک بالکل دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیتی ہیں — آپ سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی، جب الندوہ کی ایڈیٹری کے سلسلہ میں وہاں مقیم تھا۔ ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ پورے پینتیس برس ہو گئے اس وقت یاد آرہا ہے کہ آپ دیوان صائب کا ایک نسخہ عبدالحسین سے لینا چاہتے تھے۔ اس کی حیثیت پر گفتگو ہوئی تھی۔ دہلی کا جلسہ ندوہ آپ کو یاد ہے؟ غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہوگی۔ مرحوم مولانا شبلی آپ اور میں، مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھہرے تھے۔ اور شب و روز صحبتیں

رہتی تھیں۔ امین آباد لکھنؤ میں مولانا مرحوم کا بالاخانہ اور لیگ کے جلسہ کے موقع پر وہاں قیام، یہ غالباً سنہ ۱۹۱۲ء کی بات ہے۔ اٹھائیس برس ہو گئے۔ اس وقت سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ لبثنا یومًا او بعض یوم اور لم یلبثوا الا عشیۃً او ضحٰہا کا شاید یہی مطلب ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں حکیم صاحب مرحوم کے یہاں ٹھہرا تھا۔ آپ بھی دہلی آئے اور پانی پت کا بہ اتفاق سفر کیا۔ اس سفر کی صحبتوں کی ایک ایک بات اس وقت صفحۂ دماغ پر ابھر رہی ہے۔ افسوس جتنے ہم نفس تھے، ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے۔ وہ صحبتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ اب برسوں گذر جاتے ہیں۔ ایک متنفّس بھی میسّر نہیں آتا جس سے دو گھڑی بیٹھ کر اپنے ذوق طبیعت کی چار باتیں کر لوں، اب نہ زمانہ ہماری طبیعتوں کا متحمّل ہے۔ نہ ہم زمانہ کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں۔

کان لم یکن بین الحجون الی الصّفاء
انیس ولم یسمر بمکۃ سامر

اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں، چائے پی رہا ہوں۔ اور یہ خط لکھ رہا ہوں ؎

گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

یہ ساری دراز نفسی اس لئے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ آپ یاد آ گئے، ملاقات میسّر نہیں ہے تو دل کی آرزومندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں ؎

درہیچ نسخہ معنیِ لفظ امید نیست
فرہنگِ نامہ ہائے تمنّا نوشتہ ایم

اس وقت سوچ رہا تھا۔ آپ سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی غالباً ۱۹۲۰ء میں حکیم صاحب مرحوم کے یہاں دہلی میں۔ میں نظر بندی سے چھوٹا تھا، آپ حیدر آباد سے آئے تھے، دونوں جہتوں میں بُعد المشرقین تھا۔ مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی۔

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہد ہمچو توئی، یا بہ فسق ہمچو منی

معلوم نہیں ملّا[1] صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ کا کیا حال ہے؟ ان کا "کونین" کو "کوئنین" بر وزن "زوجین" کہنا اس وقت بھی دماغ میں گونج رہا ہے۔ آپ کو موقع یاد آیا؟ جلسۂ ندوہ کے موقع پر جب مولوی عبدالاحد مرحوم یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور مجھے بخار آیا تھا، میں نے کونین کی مقدار بڑھا شروع کی اور ملّا صاحب نے اس کے مثالب وقبائح پر مسلسل لیکچر دینا شروع کر دیا۔ افسوس اب ان صحبتوں کی صرف یاد باقی رہ گئی ہے!

اب اذان ہو رہی ہے۔ خط ختم کرتا ہوں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

---

[1] حاجی ملّا احمد، مصاحب خاص وقدیم نواب صدر یار جنگ بہادر سفر وحضر کے جلیس وظریف ہیں، عمر میں بڑے ہیں۔

حبیب گنج، ضلع علیگڈھ

قلم را آں زباں نہ بود کہ سرّ عاشق گوید باز
برول از حدّ تقریر است شرح آرزو مندی

صدیق حبیب، حماك اللّٰہ عن شر النوائب جو محبت نامہ ۲½ بجے صبح کو دورانِ چاء لکھا گیا تھا، ۳½ بجے سہ پہر کو عین جلسہ چاء میں پہنچا۔ ملّا صاحب "ہم پیالہ" تھے۔ اِن کے گوشِ شوق میں ایک مہربان کی صدا آرہی تھی۔

چوں با حبیب نشینی و بادہ پیمائی   بیاد آر حریفانِ بادہ پیمارا

کیا کہوں کس قدر مسرّت نامۂ گرامی پڑھ کر ہوئی۔ اُسی وقت مکرّر پڑھا اس کے بعد کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار دماغ دل بوئے محبت سے باغ باغ ہوا ہے۔ خلوص سدا بہار ہے۔ اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔ آپ نے جتنے واقعات یاد کئے ہیں، یاد دلائے ہیں، سب کی مدّت دہایوں سے زیادہ ہے۔ مگر خط پڑھنے میں دل ان کی گرمی اس طرح محسوس کرتا تھا، گویا اسی صحبت میں ہے۔ بات میں بات، دلّی کے جلسۂ ندوہ میں آپ کی تقریر کا عالم یادِ شوق میں تازہ ہے آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، تقریر کا جوش، آواز کا لہجہ گویا دیکھ رہا ہوں، سُن رہا ہوں، حالانکہ تئیس برس گذر گئے۔ سیّد رشید رضا کی عربی تقریر کا اُردو ترجمہ آپ سُنا رہے ہیں۔ کان سُن رہے ہیں۔ اسی مثال سے متاثر ہو کر میں نے اسٹریچی ہال میں ان کی عربی کی اُردو کر دی تھی۔

مولانا شبلی پر خدا کی رحمت۔ اب تک اُن کی یاد جان آفرین ہے۔
دار المصنّفین میں تو گویا تجدید بیعت ہو جاتی ہے

دماغ و دل دریں جاگاہ گاہے چاق می گردد
خدا آباد تر سازد خرابات محبّت را

جس زمانے میں آگرے میں پڑھتا تھا۔ نصف صدی گذر چکی ہے فیضی کی ایک غزل پڑھی تھی۔ اس کا ایک شعر اب تک وردِ دل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی بار اور کتنے موقعوں پر تسلی بخش ہوا ہے

اے ہم نفسان صحبتِ ما — رفتید دلے نہ از دلِ ما

مجلسِ احباب دل میں گرم ہے، دل میں اس کی گرمی ہے۔

زچشمِ مستِ تو مستم شراب را چہ کنم — زتابِ حسنِ تو سوزم کباب را چہ کنم

دیکھئے اس ہفتہ میں مولانا کی یاد کس کس طرح تازہ ہوئی۔ آپ کے الطاف نامہ سے، مولوی سید سلیمان کے خط سے۔ ایک جلد سوانح شبلی کی ختم ہوئی۔ ایک نادر نسخہ رباعیات سحابی نجفی کا ہاتھ آیا۔ مولانا کا نسخہ یاد آیا۔ ندوہ سے اس کی بابت خط و کتابت کی۔ جواب کے لئے بڑا سا نسخہ انتخاب کیا تھا۔ سب ختم ہو گیا لکھا کچھ بھی نہیں۔

محبّت نامے نے شوقِ ملاقات کی سورش میں اشتعال پیدا کر دیا ہے دل میں بے تابی ہے کہ ملاقات ہو جو صحبت گذشتہ کی گرمی تازہ کرے حیاتِ تازہ بخشے سوال یہ ہے کہ کہاں ہو؟ ملا صاحب سلامِ شوق پیش کرتے ہیں اور گوئیں بروزن زرجین کے ذکر میں دوسرا جزو بڑھاتے ہیں کہ دو بجے شب کو دودھ لانے کا حکم ہوا تھا تعمیل ہوئی تھی۔

والسلام بالاکرام
حبیب الرحمن

۱۹ - اے بالی گنج، کلکتہ
۲۹ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء

صدیق مکرّم

سفر سے واپس ہوا تو ڈاک میں صحیفۂ مودّت ملا۔ طبیعت تھکی ہوئی اور ہجومِ اشغال سے بے کیف تھی، لیکن آپ نے پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کر کے ساری تھکن بھلا دی۔

وحدثتنی یا سعد عنہا فزدتنی
جنوناً فزدنی من حدیثک یا سعد

فیضی کا کیا خوب مطلع آپ نے یاد دلا دیا۔ اب بھلانا چاہتا ہوں مگر نہیں بھلا سکتا۔

اے ہم نفسانِ محفلِ ما　　رفتید و لے نہ از دلِ ما

کاش، خط کی جگہ ہم نشینی و ہم زبانی کا موقعہ نکلتا، اگر گذری ہوئی محفلوں کو واپس نہیں لا سکتے تو کم از کم ان کی یاد میں اپنی سوگواریوں کی ایک نئی محفلِ غم تو برپا کر سکتے ہیں۔

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

آپ لکھتے ہیں جو خط صبح دورانِ چائے نوشی میں لکھا گیا تھا، وہ عین مجلسِ چائے نوشی میں پہنچا اور پڑھا گیا ــــ سُبحان اللہ، النشۂ کامانِ محبت کے جاذبہ شوق کا تصرف، جو نامۂ اشتیاق۔ "گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم" کے عالم میں لکھا گیا تھا۔ اگر عین بزمِ قدح نوشی میں نہ پہنچتا، تو کب پہنچتا؟

اُمید ہے میرے نفسہائے سرد نے مل کر چائے کے جرعہ ہائے تند و گرم گوارا کر دیا ہوگا۔ گوارا تہ بادا!

مے خور بہ شعر بندہ کہ دل تنگیت مباد
بعد از تو خاک بر سرِ اسباب دنیوی

آپ نے ایک بات کیا خوب لکھی ہے، خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامہ ہستی میں یہی ایک نعمتِ ابدی ہے۔ کیا کہوں اس جملہ نے دل پر کیا اثر کیا؟ اس کلمۂ حق کی شرح میرے دلِ درد مند سے پوچھیئے، اکاون برس کی عمر ہو چکی چند ماہ بعد باون برس پورے ہو جائیں گے۔ گویا انگریزی محاورہ میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس کے "رانگ سائڈ" میں پوری طرح آچکا۔ عام طور پہ لوگوں کی ہوش و آگہی کا زمانہ بیس بائیس برس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مبدء فیاض کی بخشش خاص نے تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں اس مرحلہ سے مجھے گذار دیا تھا، اس طرح گویا ایک کم چالیس برس ہوش و آگہی کے گذر چکے۔ ان چالیس برس کے اندر کارفرمائے غیب کی دستگیریوں نے صدیوں کی مسافتیں طے کرائیں۔ صورت و معنی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا جس سے طلب نے تغافل اور آگہی نے پہلو تہی کی ہو۔ اور فکر و عمل کی شاید ہی کوئی بلندی و پستی ہو گی جس کی پیمائش میں قدم نے کوتاہی۔ اور ہمت نے کم جوشی روا رکھی ہو۔ لیکن اگر آپ پوچھیں کہ مدت العمر کی اس جہاں نوردی کے بعد زندگی کی حقیقتوں میں سے کیا ہاتھ آیا۔ تو بلا تامل کہوں گا کہ دو باتوں کے سوا تیسری بات کہیں دکھائی نہ دی۔ ایک تو یہ کہ زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی، اس لئے کسی نہ کسی مقصد کی لگن ضرور ہونی چاہیئے۔ دوسری یہ کہ زندگی کے تمام لذائذ و تمتعات ہیچ ہیں، حکایت تشنہ و سراب

سے زیادہ نہیں۔ ہاں اگر عیش حیات کی یہاں کوئی حقیقت ہے تو صرف اس میں ہے کہ دو دلوں میں اخلاص و محبت ہو جو لمحے بھی اس کے میسر آجائیں زندگی کا حاصل اور عیش دنیا کا سرمایہ ہے۔

ہر آں کہ خاطر مجموع و یار ہم نشیں دارد
سعادت ہمدم او گشت و دولت ہم قریں دارد

کبھی شب میں چند لمحے فرصت کے میسر آجاتے ہیں تو ریڈیو میں طہران کی مجلس ساز کے چند آہنگ سُن لیتا ہوں۔ کہ کامل معنوں میں سرود ہمسایہ کے حکم میں داخل ہیں۔ کل رات کو ۹ بجے طبیعت بہت بے کیف ہو رہی تھی۔ کاغذات کے انبار کو اپنی طبیعت کی طرح پریشان و منتشر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ریڈیو کو چھیڑا تو احمد تبریزی لسان الغیب کی یہ غزل اپنے آہنگ تازہ میں گا رہا تھا

زدلبرم کہ رساند نوازش قلمے — کجاست پیک صبا گو بیا کرم کرمے
حدیث چون و چرا درد سر دہد ساقی — پیالہ گیر و بیاسا بعمر خویش دمے
بیا کہ وقت شناساں دو کون بفروشند — بیک پیالہ صافی و صحبت صنمے

وقت کے تصادفات کا کرشمہ دیکھئے۔ بعینہٖ یہی غزل آج سے بتیس ۳۲ برس پہلے ایک بزم انس میں سنی تھی اور کہاں سنی تھی۔ بغداد کی شب ماہ میں عین دجلہ کی لہروں پر :۔

عیون المہٰی بین الرصافۃ والجسر

مرزا محمد کاظم رشتی نے کہ اعیان بوشہر میں سے تھے اور زیور فضل و دانش سے محلّی اپنی کشتی میں یہ مجلس طرب ترتیب دی تھی۔ ایک تازہ کار و مغنی نے کہ مشہدی کے نام سے مشہور تھا۔ جو اپنا کمال دکھایا تھا کیا عرض کروں

دل پر کیا گذری۔ حافظ کی یہ غزل حسب حال اشعار اور بتّیس برس پہلے کی بچھڑی ہوئی دُنیا کا تصوّر ایک عجیب عالم طاری ہوگیا۔ عراق کی گذری ہوئی صحبتیں ایک ایک کر کے سامنے آگئیں۔ پچھلی صفیں اُلٹ چکی تھیں۔ مگر پھر بھی خال خال اصحاب فضل وکمال موجود تھے۔ جن کے سانچے اب موجودہ دنیا کی مٹی سے نہیں ڈھالے جاسکتے۔ شیخ العصر محمود شکری، آلوسی زادہ، شیخ ابوحمزہ کردی سیّد عبدالرحمٰن نقیب، سید فضل اللہ اصفہانی، شاعر عراق جمیل صدقی الزہاوی سیّد صدرالدین عاملی۔ سیّد محمد کاظم طباطبائی، اخوند مُلّا محمد کاظم خراسانی، مرزا محمد حسین دانش، ان میں سے ہر فرد اپنی اپنی خصوصیات میں فرد تھا۔ افسوس ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے۔ وہ کیا رخصت ہوئے اس عہد کی ساری باتیں ہی خواب وخیال ہو گئیں۔ ہا۔ کیا زمانہ تھا۔ اور کیا اس عالمِ رنگ وبُو کی جلوہ طرازیاں تھیں۔ میری عُمر بیس اکیس برس کی ہو گی۔ عہد شباب کے ولولوں سے دل کا ایک ایک ریشہ معمور تھا۔ جس منظر کو دیکھتا تھا۔ جنّت نگاہ تھا۔ جس نوائے ہستی کو سُنتا تھا۔ فردوس گوش تھی۔ عراق کے قیام کے یہ چند مہینے اب چند لمحوں سے زیادہ محسوس نہیں ہوتے۔

شهور ينقضين وما شعرنا
بانصاف لهن ولا سرار
فاما ليلهن فخير ليل
واطيب ما يكون من النهار

اس کے ابتدائی دو شعر بھی آپ کو یاد دلا دوں کہ کسی نے نوک نشتر سے صفحۂ دل پہ کھود دیئے ہیں

اقول لصاحبی والعیس تهوی
بنا بین المنیفۃ فالضمار
تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیۃ من عرار

دیکھئے رشتۂ خیال کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ ان شعروں نے حضرت شیخ آلوسی زادہ رحمۃ اللہ علیہ کی یاد پھر تازہ کر دی۔ میں نے علوم عربیہ میں اُن سے بڑھ کر کسی کو صاحبِ رسوخ و احاطہ نہیں پایا۔ ادب عربی کے حافظ بھی تھے۔ اور ناقد بھی تھے۔ تاج سبکی نے طبقات میں امام ذہبی کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، وہ ادب عربی کے معاملہ میں ٹھیک ٹھیک اُن پر راست آتا ہے۔ وھو رجل الرجال فی کل سبیل کانما جمعت الامۃ فی صعید واحد فنظرھا ایام و اشعار عرب کی پوری دنیا ان کے دماغ میں سمٹ آئی تھی، جس گوشے کو جب چاہتے تھے، دیکھ لیتے تھے۔ ایک دن مجلس مذاکرہ میں ان اشعار کا تذکرہ ہوا۔ میں نے عرار نجد کی نسبت سوال کیا۔ فوراً نو اشعار مختلف شعراء اور عہدوں کے سنا دیئے۔ جن میں عرار کا ذکر کیا گیا ہے دیوان سے اُٹھے تو شیخ ابو حمزہ نے کہ حماسہ کے حافظ تھے، راستہ میں کہا، ہماری ساری عمر اسی وادی میں بسر ہو چکی ہے۔ لیکن دو شعر سے زیادہ حافظہ میں نہ تھے تم نے دیکھا۔ کہ شیخ کے نظر و احاطہ کا کیا حال ہے۔

یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اور ٹیل کانگرس کی فرمائش سے عرب جاہلیت کی مبسوط تاریخ تین جلدوں میں لکھی تھی۔ بلوغ الارب پہلے بغداد میں چھپی تھی۔ پھر مصر میں بھی چھپ گئی۔ ان ہی کے بھائی شیخ نعمان آلوسی زادہ

تھے۔ انہوں نے جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین لکھی اور نواب صدیق حسن خان مرحوم نے مصر میں چھپوائی۔ ان کے والد شیخ شہاب الدین آلوسی مفتی بغداد کی تفسیر روح المعانی مشہور ہے۔

ان کے خاندان سے میرے خاندان کا پہلا رشتہ کچھ عجیب طرح کے حالات میں قائم ہوا تھا۔ والد مرحوم جب ۱۲۹۳ھ میں عراق گئے تھے۔ تو سید عبدالرحمٰن نقیب مرحوم کے والد سید علی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین تھے۔ ان ہی کے یہاں ٹھہرے۔ شیخ آلوسی کا انتقال ہو چکا تھا مگر ان کے مصنفات کے قلمی نسخے سید کے خاندان میں متداول تھے اور بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سید مرحوم نے شیخ کی تفسیر روح المعانی بڑے فخر و مباہات کے ساتھ دکھائی کہ ہمارے شیخ کی تصنیف ہے۔ شیخ آلوسی اگرچہ بظاہر شاہراہ عام سے الگ نہیں ہوئے تھے کہ عہدہ افتاء اور رجوع عام کا علاقہ دامن گیر تھا۔ مگر دراصل سلفی المشرب تھے۔ اور تقلید کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہو چکی تھیں چنانچہ تفسیر میں کہیں کہیں اس کی جھلک صاف نظر آجاتی ہے۔ والد مرحوم حنفیت اور اشعریت میں بڑے ہی شدید تھے۔ ان کی نظر اس معاملہ میں کب چوکنے والی تھی۔ ایک دن عین مجلس دیوان میں کہ شیخ نعمان آلوسی زادہ بھی موجود تھے، سید علی مرحوم نے پوچھا، "آپ نے شیخ کی تفسیر کو کیسے پایا؟" والد مرحوم نے بلا تامل کہا "خوب ہے مگر کہیں کہیں وہابیت اور اعتزال کی بو مجھے محسوس ہوئی۔ یہ بے پردہ ایراد تمام مجلس پر گراں گذرا۔ خصوصاً شیخ نعمان برادر صحبت نے مجلس مباحثہ کا رنگ اختیار کر لیا۔ شیخ آلوسی نے حیات خضر سے انکار کیا ہے، والد مرحوم نے سب سے پہلے اس کا

تعقب کیا۔ پھر تفسیر کے تمام ایسے مقامات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے اور ایک رسالہ تعقبات میں تصنیف کر کے شیخ نعمان کو بھیجا۔ شیخ نے اس کے جواب میں ایک مکتوب لکھا۔ والد مرحوم نے جواب الجواب لکھ کر اس مکتوب کو بھی مع اپنے جواب کے رسالہ کے آخر میں شامل کر دیا۔

مرحوم سید عبد الرحمٰن نقیب نے مجھے وہ اطاق دکھایا تھا، جہاں والد مرحوم بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔ نیز حرم کا وہ حصہ جہاں والدہ مرحومہ ٹھہری تھیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا اصل رسالہ بھی روح المعانی کے قلمی نسخے کے ساتھ کتب خانہ میں موجود تھا۔

سید مرحوم کے تفرس نے پہلی ہی ملاقات میں تاڑ لیا تھا کہ میرے خیالات کی رفتار دوسری ہے۔ مجھے دوسرے دن شیخ سے ملایا تو یوں تقریب کی کہ تمہیں شیخ خیر الدین ہندی یاد ہیں جنہوں نے شیخ کبیر (یعنی شیخ آلوسی) کی تفسیر پر تعقبات کئے تھے۔ یہ اُن ہی کے فرزند ہیں۔ لیکن مجھے اُن سے وہی بُو آئی جو اُن کے شیخ نے تمہارے شیخ کی تفسیر میں سونگھی تھی۔

کیا عرض کروں کہ کس محبت و شفقت کے ساتھ ملے۔ معانقہ کیا۔ پیشانی چومی۔ میں نے حجاز کے آدابِ تعظیم کے مطابق کہ بچپن سے اپنے گھر میں اس کا عادی ہو گیا تھا، ان کے گھٹنوں کا بوسہ دینا چاہا تو فوراً گھٹنے ہٹا لئے اور باز رکھنے کے لئے پکڑ لیا۔ اس کشمکش میں سر تو اُن کے گھٹنوں تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن پگڑی اُن کے قدموں پہ گر گئی۔ اور بے اختیار حافظ کا یہ شعر یاد آ گیا

اے خوشا آں عاشقِ سرمست کہ بر پائے حبیب
سر و دستار نداند کہ کدام اندازد

بار بار فرماتے تھے۔ "من این اخذت ھذا المشرب؟"
ہمیں بیرراہ بزرگوں سے ملی اور چل کھڑے ہوئے تمہیں تو خود ڈھونڈھ کر
سُراغ لگانا پڑا۔

والد مرحوم نے کئی بار عود کا عطر شیخ نعمان مرحوم کو بھیجا تھا۔ انہیں
یہ بات یاد تھی، مجھے دیکھتے تو فرماتے "عود مندل کی خوشبو تم سے آتی
ہے" "دیہ مندل" کا ر و منڈل کی تعریب ہے۔ کہ ہندوستان کا جنوبی ساحل
اس نام سے مشہور تھا)

۱۹۱۲ء میں میں نے جب الہلال نکالا تو انہیں نہیں بھیجا کہ اُردو کا
پرچہ کیا بھیجوں، لیکن مصر کے اخبارات میں جب اس کا ریویو اُن کی نظر
سے گذرا تو مجھے شکایت کا خط لکھا، سرنامہ ابن الفارض کا یہ مطلع تھا:

قلبی یحدثنی بانک متلفی
روحی فداک عرفت ام لم تعرف

دیکھیے آپ کی صدائے دل نواز نے دل ہزار شورش کے ساتھ کیا کیا
جدید آداب مکاتب سے قطع نظر کر کے کاغذ کے دونوں صفحے سیاہ کرتا
رہا۔ پھر بھی پانچ ورق ختم ہو چکے اور شوق مخاطبت ہے کہ رُکنے کا نام
نہیں لیتا۔ ع

بہ صد دفتر نمی گنجد حدیث درد مشتاقے

ہر چند چاہتا ہوں قلم روکوں مگر روک نہیں سکتا۔ دماغ سنیما کا پردہ بن
گیا ہے۔ ایک تصویر ہٹتی ہے تو دوسری نمودار ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا
ہے کہ صحبت ختم نہ ہو۔ ایک ذکر ختم ہو جائے تو دوسرا چھیڑ دوں۔ ع

قدرے گر میم وہم بر سرِ افسانہ روم

دیکھیئے کب ملاقات ہوتی ہے۔ وقت کے سیاسی حالات ایسے ہو رہے ہیں کہ کہہ نہیں سکتا کل کیا صورت پیش آ جائے۔ اگر حالات کی رفتار ایسی نہ ہوتی تو یقین کیجیئے دل آرزومند کی شورشوں کا یہ حال ہے کہ کلکتہ سے اٹھتا اور سیدھا بھیکم پور پہنچ کر آپ سے بغل گیر ہوتا۔

وابرح ما یکون الشوق یوما
اذا دنت الخیام من الخیام

ملّا صاحب کے سلام شوق سے بہت جی خوش ہوا۔ میرا بھی سلام انہیں پہنچا دیجیئے۔ اور اُن کے حافظہ کی داد دیجیئے۔ صفحہ ختم ہو گیا۔ ورنہ اس دو بجے کے دُودھ کی سرگذشت سناتا۔ والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

ابوالکلام

حبیب گنج - علی گڈھ
۱۳ - اکتوبر ۱۹۴۰ء

مکرم حبیب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،
قند مکرّر[1] کا شکر مکرّر۔ ڈرتا ہوں کہ مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ پھر کہتا ہوں کہ صحیفۂ ثانیہ میں سچ کہتا ہوں۔ اور سچ کے قدردان کے سامنے کہتا ہوں۔ پھر ڈرنا کیسا؟ آپ نے یہ خط لکھ کر دل میں ایک عالم پیدا کر دیا کیا کہوں، ایک بار پڑھا۔ اسی صحبت میں دوبارہ پڑھا۔ تیسری مرتبہ آواز سے پڑھا ایک نکتہ سنج ادیب[2] کو سُنایا۔ ہر بار کے پڑھنے میں یہ عالم تھا کہ دل کسی خلص

---

[1] ماسٹر سید مظہر علیم فرید آبادی، بی اے مرحوم جلیس نواب صدر یار جنگ بہادر۔

کے معانقے کی گرمی کا لطف محسوس کر رہا تھا۔ آنکھیں پُرنم تھیں۔ چوتھی مرتبہ اس وقت پڑھا کہ جواب لکھنے بیٹھا ہوں، گرمیِ تحریر کی تاثیر دیکھئے کہ آپ کے ہر واقعہ نے جو زیبِ قلم ہوا، مجھ کو بھی اسی کے مطابق دل فروز واقعہ یاد دلایا۔ شروع میں یہ شعر زیبِ رقم ہوا۔

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

مجھ کو یاد آیا کہ علی حزیں نے لکھا ہے۔ کہ ایک موقعہ پر جب اُن کا دل محبت کا نشتر خوردہ تھا۔ ایک شب اصفہان کی کسی صحبت میں جو باغ میں تھی، علی کو ساری نے ساز درست کر کے یہ شعر سنایا

امشب بیا تا در چمن سازیم پُر پیمانہ را
تو شمع و گل را داغ کن من بلبل و پروانہ را

صبح تک یہی نغمہ تھا اس شعر کو گاتا۔ چپ ہو جاتا۔ پھر گاتا پھر چپ ہو جاتا۔ حزیں کہتا ہے کہ معلوم نہیں کتنی مرتبہ سلطانِ روح نے قالب خالی کیا تھا۔ میں نے جس عالم میں یہ واقعہ پڑھ کر لطف لیا تھا، وہ آپ کے شعر بالا سے تازہ ہو گیا۔

آپ نے بغداد کا ذکر چھیڑا، مجھ کو وہ وقت یاد آگیا۔ جب دو نوجوان ابوالکلام آزاد اور ابوالنصر آہ نمایاں ہوئے تھے۔ امرتسر سے وکیل اخبار منشی غلام محمد مرحوم کی ادارت میں شان وقار کے ساتھ نکلتا تھا۔ اس میں آپ کے مضامین ہوتے تھے۔ جو اس وقت بھی لطفِ کلام اور خوبیِ معانی کے جوہر سے آراستہ ہوتے تھے۔ اسی سلسلہ میں یہ سُنا کہ آپ بغداد چلے گئے۔ بغداد کی روداد آپ نے اب سنائی۔

ریڈیو نے احمد تبریزی کا آہنگِ تازہ سُنا کر آپ کو یادِ بغداد میں محو کر دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ حافظ کی جس غزل

زدلبرم کہ رساند نوازشِ قلمے

کے ریڈیو پر سننے سے ۳۲ برس اُدھر کی صحبت آپ کو یاد آئی۔ اسی غزل نے مجھ کو کیا یاد دلایا۔ آپ نے غزل کے تین شعر نوازش نامہ میں نقل کئے تھے۔ میں نے پوری غزل دیکھنے کے لئے حافظ کا دیوان نکلوایا۔ وہ نسخہ ہاتھ میں آیا جو ملک التجار نے ایرانی خط میں چھپایا تھا۔ آج سے چالیس برس پہلے یہ نسخہ زیرِ مطالعہ رہا تھا۔ جابجا انتخاب کے نشان کئے تھے۔ اب جو یہ غزل نکالتا ہوں تو اس پر انتخاب کا نشان موجود پاتا ہوں۔ دل پر اس توارد و تصارف سے عجب عالم طاری ہوا۔ آپ کو دجلہ کی مواجی اور شب ماہ کی تابش یاد آئی۔ مجھ کو خود اپنی طبیعت کی مواجی اور تلاطم نے بے تاب کر دیا۔ کیا کہوں کیا عالم تھا۔ اور کس کے اثر سے تھا۔ اجمالاً اس عالم کی شرح نگار ایک غزل ہے۔ جو اسی کیف میں موزوں ہوئی تھی ؎

زجامِ لعلِ تو مستم شراب را چہ کنم
خوشم بسوزِ دلِ خود کباب را چہ کنم

یہ مطلع خواجہ آصفی کا ہے اسی طرح پر میں نے غزل عرض کی تھی۔

زچشمِ مستِ تو مستم شراب را چہ کنم
زتابِ حُسنِ تو سوزم کباب را چہ کنم
حدیثِ دوست بگوشم رسد ز پردۂ دل
حکایتِ نے و صوتِ رباب را چہ کنم
نہ کردہ جلوہ بُتِ شوخ و باختم دل و دیں
اگر برافگند از رُخ نقاب را چہ کنم

حسبِ عادت غزل علامہ شبلی مرحوم کے ملاحظہ میں پیش کی گئی حیدر آباد سے ۱۹ ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو تحریر فرمایا خدا کی قسم غزل کی غزل مرصع ہے اور یہ شعر تو دل میں لکھ لینے کا ہے "اگر بر افگند از رُخ" الخ دیکھیے، ۳۲ اور ۴۰ سال کے گذرے ہوئے دو واقعے کس طرح متصادف ہو گئے۔ یہ خلوصِ ذوق کا کرشمہ ہے۔ آپ کو بہت سے اہلِ کمال یاد آئے تھے۔ مجھ کو ایک علامہ کی یاد نے محوِ ذوق بنا دیا۔

ولیس اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

رحمت باد بر شبلی، نعمت بر آزاد!

حدیثِ تازہ گویم

چوتھا پانچواں دن ہے۔ ایک شب کو تراویح کے بعد عنبری سبز چار کا دور تھا۔ چند ہم مشرب جمع تھے۔ ملا صاحب بھی تھے۔ لسان الغیبؒ کو زحمتِ قدوم دی گئی۔ سرورق غزل نکلی ؎

معاشران گرہ از زلف یار باز کنید
شبے خوش است بدیں وصلہ اش دراز کنید

(دیکھیے، زلفِ معنبر اور چاء عنبری کا وصلہ کیا خوب ہوا۔ شب کی خوشی دو بالا ہوئی۔)

حضور خلوت انس است و دوستاں جمع اند
واں یکاد بخوانید و در فراز کنید
نخست موعظہ پیر صحبت ایں حرف است
کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید
بہ آں کسے کہ دریں حلقہ زندہ نیست بعشق
برو، چو مُردہ بفتوائے من نماز کنید الخ

غزل مکرّر پڑھی گئی۔ حیرت تھی کہ لسان الغیبی کا پورا جلوہ دکھا رہی تھی۔
تراویح کے بعد دوسری نماز کا فتویٰ خاص لطف دے گیا۔
جو گناہ آپ سے سرزد ہوا تھا۔ میں نے عمداً اس کا ارتکاب کیا۔ دونوں صفحے بھر دیئے۔ کاغذ کا قحط ہے۔ کلکتہ کی ایک تعمیل کنندہ فرم دانت دکھا گئی۔
ملّا صاحب کے سلام پر ختم کلام۔ مگر صد سخن باقی۔

حبیب الرحمٰن

۱۹۔ اے، بالی گنج، سرکلر روڈ کلکتہ
۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

صدیق مکرّم

تعلیقۂ گرامی میں صرف الفاظ ہی نہ تھے، خوشبو بھی تھی، آنکھیں سوادِ خط سے خورسند ہوئیں۔ دماغ نے محبتِ بے ریا اور خلوصِ اہل صفا کا عطر سونگھا
انفلوئنزا کی شدت سے سر قابو میں نہ تھا جسم بے حال ہو رہا تھا۔ ع

زبے تابیٔ سرم می گردد و بالین نمی یابد

مگر آپ کی صدائے محبت نے اُٹھا کر بٹھا دیا۔ اب تکیہ کے سہارے یہ سطریں لکھ رہا ہوں

زنسیم جاں فزایت دل مردہ زندہ گردد
زکدام باغ اے گل کہ چنیں خوش سنبعیت

آپ نے شیخ علی حزیں کا واقعہ کیا خوب یاد دلایا۔ اسی عالم میں اس نے غزل لکھی تھی

بجرم عشق اگر کشتی مرا ممنون احسانم
گناہ زاہد بیدرد یارب چیست حیرانم
کتاب عشق لوح دل بود در مکتب ہستی
نکو کردی بسطر تن کشیدی خط بطلانم

شیخ کو سوز و تپش کی جو دولت میسر آئی تھی، الحمد للہ اس نامراد کا دامن نیاز اس سے مہینوں سرمایہ اندوز رہا۔ بلکہ کہنا چاہئے کم و بیش دو سال تک اسی عالم میں زندگی بسر ہوئی تھی۔

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ چکی ہے اسی اضطراب میں

اس زمانے میں سماع کی کیفیتوں اور شورش انگیزیوں کے جو واردات و سوانح تجربے میں آئے بقول شیخ کے سرتاسر حالی ہیں۔ زبان حرف و صورت ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ کسی راہ چلتے فقیر کی ایک صدائے خوش ہی کام کر گئی۔ اس زمانے کا واقعہ ہے کہ آگرہ میں گذر ہوا۔ موسم بہار کا آغاز تھا اور چاندنی راتیں تھیں۔ ایک دن شام کو جمنا پار کے ایک گوشۂ چمن میں بعض یاران ہمدم جمع ہوئے۔ اور تمام شب صحبت سوز و ساز جاری رہی ابتدا میں چند چیزیں ہندی اور اردو کی زبان نغمہ پر رواں ہوئیں۔ مگر دل کی بے تابیوں کو جوش و خروش میں نہ لا سکیں۔ ناگاہ امیر خسرو کا یہ مطلع پردۂ ساز میں بہ ہزار دل کشی و رعنائی زمزمہ پرداز ہوا

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

کیا کہوں اور کیونکر کہوں کہ بجز د سماع کیا عالم طاری ہو گیا۔ یہ مطلع بارہا

پڑھنے اور سننے میں آچکا تھا۔ مگر اس وقت ایسا معلوم ہوا گویا زندگی میں پہلی مرتبہ گوش زد ہوا ہے اور اس کے صاف صاف لفظوں میں جو صاف معانی پوشیدہ ہیں، اُن کی حقیقت کا پہلی مرتبہ انکشاف ہوا ہے۔ یہ شیخ نے جو کچھ لکھا ہے، انشا پردازی نہیں ہے۔ حقیقت حال ہے روح نے بارہا کالبد خاکی کو خاکی کرنا چاہا، مگر پھر اٹک کر رہ گئی۔ باوجودے کہ ایک قرن سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے۔ مگر چولھا ان وقتوں میں گرم ہوا تھا آج تک ٹھنڈا نہیں ہوا۔ انگارے بجھ چکے، مگر خاکستر کریدی جائے، تو اب بھی چنگاریاں نکل آئیں گی۔ اس سے زیادہ آپ کو کیا لکھوں کہ الحمد اللہ اس کوچہ کے رسم وراہ سے آشنا اور اس دولتِ معنوی کی بخششوں سے سرمایہ اندوز رہ چکے ہیں۔ والعیان لا یحتاج الی الشرح والبیان۔

ومن بعد ھذا ما یدق بیانہٗ

وما کتمہ احظی لدیہ واجمل

آپ نے اپنی زندگی کے بعض واردات، وسوانح کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ مزید کیف و ذوق کا باعث ہوا۔ اور اسی کی تحریک سے مندرجہ بالا سطور بے اختیار نوک قلم پر رواں ہو گئیں، ورنہ اس باب میں تکلم وحکایت اصحاب درد وذوق کا شیوہ نہیں۔ شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ شاعر نہ تھے مگر ایک شعر کیا خوب کہہ گئے ہیں کہ شاہ عبدالحق محدث کے وردِ زبان ہو گیا تھا مکاتبات میں بار بار نقل کرتے ہیں۔

سخن عشق بدل ورنہ دلب را مکشا

سر ایں شیشہ فرو بند کہ بادے نہ خورد

"سر ایں شیشہ فرو بند" میں کیا قیامت کر گئے ہیں۔

شیخ کے تذکرے نے اپنی طبیعت کا ایک خاص تاثر یاد دلا دیا میں نے جب پہلے پہل ان کی خود نوشتہ سوانح عمری پڑھی تھی۔ تو ان کے اوضاع و روش سے طبیعت بیحد متاثر و مالوف ہوئی تھی۔ اور ایک طرح کا خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ زمانے کی کوئی ناموافقت ان کے علو طبع، عزتِ نفس اور خودداری و نامرادی پر غالب نہ آسکی۔ یہ اوصافِ حمیدہ اگرچہ بحدِ غرور و کبر پہنچ جائیں، بہرحال ذلتِ نفس اور دنائتِ طبع کے خصائل رذیلہ سے بدرجہا افضل و راجح ہیں۔ آپ کو شاید یہ سُن کر تعجب ہو کہ شیخ نے ہندوستان اور اہل ہند کی ہجو میں جو کچھ کہا تھا۔ مجھے اس کا بھی کوئی گلہ نہ تھا۔

ناسپاس سپرتی است تمنائے مردمی
از دیولاخ ہند کہ آدم نداشتہ ست

اب بھی دیکھتا ہوں کہ طبیعت میں یہ تاثر بدستور باقی ہے۔ شیخ کے متعدد رسائل ہاتھ آئے جن کا تذکرہ میں ذکر کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا پایہ حکمت و معقولات میں بلند تھا۔ اور طبیعت مجتہدانہ نظر و کاوش سے بھی خالی نہ تھی۔ سراج الدین علی خاں آرزو، شمس الدین فقیر اور ٹیک چند بہار وغیرہم کے ان سے معاملات حکایت زاغ و بلبل کا حکم رکھتے ہیں۔

آپ کی غزل پر علامہ شبلی کی تحسین بڑی سے بڑی سند ہے جو اس عہد میں مل سکتی تھی۔ یہ شعر کتنا رواں اور ڈھلا ہوا نکلا ہے۔

حدیث دوست بگوئم رسد ز پردۂ دل
حکایت نے و صوت رباب راچہ کنم

اور نقاب کے قافیہ میں تو واقعی ردیف چیخ اٹھی ہے

اگر برافگند از رُخ نقاب راچہ کنم

علامہ مرحوم کی یاد میں آپ کو کتنا برمحل شعر یاد آیا

ولیس اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

خواجہ حالی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُن کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات بنوع وکمال کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں، سرتا سر مغز بے پوست تھی۔ بمشکل کوئی مہینہ ایسا گذرتا ہے۔ کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بہ دل نہ ہوتی ہو وہ کیا گئے علم وفن کی صحبتوں کا سرتا سر خاتمہ ہو گیا۔

مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے۔ والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا ہے۔ اس اشتراک عادت نے ایک خاص رشتۂ انس پیدا کر دیا تھا۔ جب کبھی یک جائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجیب لطف وکیفیت کا وقت ہوتا۔ چائے کا دور چلتا۔ اور علم وفن اور شعر وادب کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق وفکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے۔ اور وہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملایانہ طلب علم کے ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی۔ خشکی طبع جو اس راہ کے مہالک وآفات میں سے ہے۔ انہیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ شاعری کے ذوق وفہم کا جو اعلےٰ مرتبہ ان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں، ان پر ختم ہو گئی۔ کئی مرتبہ مجھے خیال ہوا۔ کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ ہوتے۔ تو اُن کا

وزن شعر فارسی میں غالب سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ پھر غالب جو کچھ ہے، تغزل و مدح کے محدود میدانوں میں ہے۔ لیکن مولانا نے فارسیت کے ذوقِ اعلےٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر و تخیل کے نئے نئے میدان پیدا کئے جن پر اُن کی قومی نظمیں گواہ ہیں، خصوصاً حیدر آباد والی نظم، اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تنہا شاعر ہیں۔ جنہوں نے فارسی شاعری کو اس کے اسلوبِ شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔

اس معاملہ کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران کے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں، جن کی ترتیب و اشاعت میں غریب براؤن نے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعراء بہار ہیں۔ خدا ان کے کلام کے مطالعہ کی بدمزگی سے محفوظ رکھے۔

غزل میں تو یقیناً مولانا کے یہاں غالب سے کہیں زیادہ سرجوشی و کیفیت ہے۔ اور حقائق واردات کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے۔ مولانا کا ایک شعر سینکڑوں مرتبہ دہرا چکا ہوں۔ لیکن پھر بھی بے اختیار دل کی گہرائیوں میں سے اُبھر آتا ہے

دو دل بودن درین رہ سخت تر عیبے است سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

میں جانتا ہوں کہ یہ شعر مولانا ہی کہہ سکتے تھے۔ کیونکہ اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہے۔ جب تک وہ طاری نہ ہو، اس طرح کی صدا اٹھ نہیں سکتی۔ خواجہ حالی مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس شعر پہ

گھنٹوں مجھے خود فراموشی رہی۔

افسوس اب وہ وقت آگیا۔ کہ ان تذکروں کے لئے بھی کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ کہاں جائیے اور کس سے باتیں کیجئے جن سے خطاب تھا وہ سب رخصت ہو گئے۔ ہاں الحمد للہ ایک آپ کی ذات گرامی باقی ہے، لیکن یک جائی میسر نہیں۔

سراغِ یک نگاہ آشنا در کس نمی یابم
جہاں چوں لرگستہ نی بے تو چشم کور می ماند

بدایونی نے ایک رباعی لکھی ہے، معلوم نہیں کس کی ہے۔ اکثر زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند
در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلسِ عمر
یک لحظہ ز ما پیشترک مست شدند

اب تھک گیا ہوں اور تکیہ پر سر رکھتا ہوں۔ ملّا صاحب کو بعد سلام کہئے کہ کونین کی گولیاں سامنے دھری ہیں۔ مگر افسوس کہ آپ نہیں ہیں۔ کہ رات گئے دو بجے حلوائی کے یہاں کا دودھ پلائیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

حبیب گنج، علی گڑھ
۶ر دسمبر ۱۹۴۰ء

مکرم حبیب، صدیق حمیم۔ السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
۲۶ر اکتوبر کا گرامی مکتوب برابر پیش نظر، بلکہ نور نظر رہا۔ بار بار دیکھا۔ اس وقت بھی پڑھ لیا۔ دو یادیں تازہ ہوئیں۔ بلکہ نہیں، ایک عالمِ سوز وگداز کی، حکم ہے۔ "سرایں شیشہ فرو بند!"
لہذا اسی قدر اشارہ کافی ہے۔ دوسری شیخ علی حزیں کی۔ میرا خیال آپ کے خیال کے ساتھ طابق النعل بالنعل ہے۔ کجا حزیں، کجا حزیں کے معترضین! اہل ہند کو برا بھلا کہا تو کہا۔
ع۔ ہنر کے دیکھنے والے ہنر کو دیکھتے ہیں
شعر العجم میں علامہ مرحوم نے شیخ کو نہیں مانا، میں نے ٹوکا۔ ایک بار سے زیادہ بنارس میں مزار شیخ دیکھا ہے۔ اور اس کو غزل فارسی کا مدفن محسوس کیا ہے۔ تیسری یاد علامہ شبلی مرحوم کی!
آپ کے پرشوق الفاظ نے آتش شوق تیز کر دی۔ اسی زمانہ میں ایک حادثہ اتفاق پیش آیا۔ مدت دراز کے بعد رباعیات سحابی نجفی کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آگیا۔ رباعیات کے متعلق تلاش شروع ہوئی۔ کس قدر ہیں، کہاں کہاں ہیں۔ کسی نے یاد دلایا کہ ستمبر ۱۹۳۷ء میں الندوہ میں مولانا نے ایک مضمون سحابی پر شائع کیا تھا۔ اسی ضمن میں ایک دوسرے مضمون میں ایک دو آتشہ جام نگاہ شوق میں چھلک گیا۔ مآثر رحیمی کے طبع ہونے کا شوق ظاہر فرمایا گیا ہے۔ اس ضمن میں چار نام زبانِ قلم پر آئے۔ چوتھا نام میرا تھا۔ اس عنوان سے

"حبیبِ صادق" جوشِ کیف سے جھوم گیا۔ حضرت میر درؔد کا شعر یاد آیا۔ کیف دو بالا ہو گیا۔

دونوں جہان کی نہ رہی پھر خبر اُسے
دو پیالے جس کو آنکھوں نے تیری پلا دیئے

مولانا کے دونوں لفظ دو پیالے تھے۔ بلکہ دو خم، نہیں دو میخانے آج تک جب یاد آتے ہیں، سرشار نیاز کر دیتے ہیں۔

من شیشہ بدل دارم پیمانہ بدل دارم
قربان نگاہ تو میخانہ بدل دارم

شبلی کی نگاہ! دل مستِ ذوق کیونکر نہ ہو۔ رحمتِ الٰہی بر دے۔
آپ نے گرامی نامہ میں حضرت امیر خسرو کا ایک شعر واقعۂ آگرہ کے ضمن میں لکھا۔ ع جان زتن بردی و در جانی ہنوز

دیکھئے ذوق میں ذوق، بات میں بات، نواب اسحٰق خان مرحوم کے دورِ سیکرٹری شپ میں جو اہتمام کلام خسرو کی اشاعت کا ہوا تھا اس کا سلسلہ اب پھر جاری کیا ہے کچھ فنڈ باقی تھا۔ پہلے مثنویاں شائع ہوئیں، دیوان نہ ہوا۔ اب وسط الحیوٰۃ کو ہاتھ میں لیا ہے۔ مصحح نے چند جزو صحیح کر کے دیئے ہیں۔ وہ ان دنوں ذوق آفرین ہیں، اتفاقیہ چند معاشر بھی ہیں۔ شب کو ایک وقت کچھ کلام پڑھا، سنا سنایا جاتا ہے۔ ایک غزل پڑھی گئی چھوٹی بحر کی، مگر سوز و گداز کا بحرِ بے پایاں دو تین شعر سُن لیجئے مقطع کا آخری مصرع معلوم نہیں کتنی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر مرتبہ دل بحرِ نیاز میں غوطہ کھا جاتا ہے۔ اور تازہ دم ہو کر اُبھرتا ہے۔

دیوانہ شدم در آرزویت اے چشم ہمہ جہاں بسویت

ما ئیم و تحیّرے و خموشی | و آفاق ہمہ بگفتگو بیت
دی روئے تو دیدم و نمردم | شرمندہ بماندہ ام زرویت
خسرو بکمندِ تو اسیر است | بیچارہ کجا رود زکویت

اللہ اکبر! بیچارہ کجا رود زکویت؟ زمانہ پلٹے کھا رہا ہے۔ انقلاب کے سیلاب موجزن ہیں صحبتیں درہم برہم ہو رہی ہیں۔ دستِ اجل کار فرما ہے۔ جو رونقِ بزم اور نورِ چشم تھے، زیرِ خاک جا سوئے۔ اس پہ بھی سرسودازدہ اپنے خیال میں ہے شبلی سے باتیں کرتا ہے۔ شوقِ نیاز کو بدستور تازہ پاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جو احباب چلے گئے، ہنوز سرسودازدہ اور قلبِ دیوانہ ان کی حضوری محسوس کر رہا ہے۔ اُن سے جن چیزوں کو تعلق تھا۔ وہ اب بھی ویسی ہی عزیز ہیں جیسی اُن کی حیات میں تھیں خلاصۂ کلام دائرہ اخلاص میں بدستور گامزن ہے۔ قدم فرسا ہے۔ کوئی لوکتا ہے تو کوئی چیخ اُٹھتا ہے۔ ع

"بیچارہ کجا رود زکویت؟"

یہ ہے بیچارگی کی قوت تا کرا دہند!

درازیٔ ہمہنگی معاف۔ آپ کا محبت نامہ پڑھوں، محبت کی باتیں سنوں اور پھر قلم قابو میں رہے۔ ع

"ایں خیال است و محال است و جنوں"

ثم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جوششِ شوق نے معذرت تاخیرِ جواب نہ لکھنے دی، یہ انتظار رہا کہ سفر سے مع الخیر مراجعت ہو تو لکھوں۔ الحمد للہ خبر بخیر رسی کلکتہ پڑھی۔ جواب عرض کر دیا۔

حبیب الرحمٰن

دہلی
۱۹؍ فروری ۱۹۴۲ء

وفا کنند کہ بیگانہ آشنا گردد
ترا چہ شد کہ نمی پرسی آشنائے را

ابوالکلام

حبیب گنج، ضلع علی گڑھ
مورخہ ۲۳؍ فروری ۱۹۴۲ء

حبیب نواز، آشنا پرور کرم طراز
السّلام علیکم و قلبی لدیکم۔ کل جان پرور نامہ پہنچا۔ دیکھ کر فرطِ شوق سے دل تڑپ گیا۔ زبان سے اختیار نکلا ع

بوئے خوشِ تو ہر کہ ز بادِ صبا شنید
از یار آشنا سخنِ آشنا شنید

زیبِ نامہ صرف ایک سطر تھی، مگر ایک دفترِ محبت اس میں بھرا ہوا تھا محبت نہ ہو تو شکوۂ نا آشنائی کیوں ہو؟ جو شکوہ خبر محبت دے اس پر سو شکر قربان۔

ارشاد ہے ترا چہ شد۔ سنئیے چہ شد۔ جب سے سابق روح پرور مراسلت نذرِ تفرقہ ہوئی، دل اس تمنا سے لبریز رہا کہ پھر آغاز پذیر ہوتی۔
ہمہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبح گاہی بہ پیام آشنائے بنوازد آشنا را

اس تمنا میں نقل و حرکتِ گرامی دیکھتا رہا۔ جویائے موقع رہا۔ ایک اتفاق! حیدر آباد سے واپسی میں وارد دھا اسٹیشن پہ اس وقت پہنچا۔ کہ دس منٹ پہلے تشریف بری ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر سید محمود برسوں میں ملے۔ پھر بھی دل اثر اخلاص سے بدستور نرم و گرم تھے۔ ملے اور خوب ملے۔ بڑی جان فزا اور روح پرور صحبت رہی۔

ہر جا کہ من و دوست ہم باز رسیدیم
از بیم بد اندیش لب خویش گزیدیم
بے واسطۂ گوش ولب از راہ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

باز آیم بر مطلب۔ شکر ہے کہ بالآخر نظر آشنائے توجہ ہوئی۔ لطف مکالمت کا موقع ہاتھ آیا۔ اتفاقاً جس وقت ڈاک ملی۔ ایک عزیز کی تقریب میں جا رہا تھا۔ ڈاک بدستور رکھ گیا۔ واپس آ کر شب کو کھولی، پڑھی شگفتہ نامۂ آشنائی نے کیا کہوں کیا لطف دیا۔ کس زبان سے کہوں، کس قلم سے لکھوں۔ زیب نامہ شعر بار بار پڑھا۔ ہر بار تازہ لطف پایا۔ ارادہ کیا صبح جواب لکھوں گا۔ لطف ملاقات کا سرور حاصل ہو گا۔ اسی سرور میں آمادۂ خواب ہوا۔ آمد خواب کے کیف میں جانبِ نیشاپور سے آواز آئی۔

شب امید بہ از صبح عید می گذرد
کہ آشنا بتمنائے آشنا خفتہ است

کیف دو بالا ہو گیا۔ شب کو جب آنکھ کھلی، یہی آواز جان نواز رہی۔ بیداری بھی خواب کی طرح شیریں رہی۔

ارشاد ہے۔ بمی پرسی، حقیقت سنج عرف شیرازی نے جس کے آشنا

سنج ہونے کی قسم کھائی ہو۔ وہ نہ پوچھے، کیونکہ ممکن ہے

بنامِ آں حبیبِ آشنا سنج
کہ در آمد ز آتشِ معمورۂ رنج

جیسا کہ اوپر عرض کیا۔ صرف انتظار موقع تھا۔ حافظ کا یہ شعر وردِ زبان۔

ہمہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبحگاہی — بہ پیام آشنائے بنواز د آشنا را

شکر ہے موقع آیا۔ شکوہ ناآشنائی ہوا۔ بروقت ہوا اور بجا ہوا ——

زندہ باد آزاد۔ "الشیئ بالشیئ یذکر" اس دوران میں اعظم گڈھ سے مسودہ حیات شبلی کے اجزاء آتے رہے، پڑھتا رہا، بھیجتا رہا۔ بے مبالغہ بیک وقت بیسیوں صفحے پڑھے، جب رکھے حسرت رہی کہ اور پڑھے ہوتے سرگذشت کا لطف حکایت نے دیا۔ ؎

ہے آج جو سرگذشت اپنی
کل اس کی حکائتیں بنیں گی

دل محسوس کرتا تھا کہ علامہ کی صحبت میں حاضر ہوں، لطف صحبت سے مستفید و فیض یاب ہوں، آہ کیا صحبت تھی، کیا فیض تھا۔ فخر اس میں تھا کہ ہر موقع پہ ایک نیاز مند حاضر آتا تھا۔ شبلی و شروانی کی زندگی کچھ اس طرح منوط رہی کہ جہاں علامہ کا فضل نور افشاں ہے وہاں شروانی کی نادانی بھی جلوہ خیز ہے

والسلام ختم الکلام

نیاز نشان
حبیب الرحمن

۱۹ - اے بالی گنج ، سرکلر روڈ - کلکتہ
۴ ؍ مارچ ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

میرے ایک نالۂ درد نے آپ کے دل محبت نواز کو ایسا ہلا دیا کہ چار صفحوں کا صحیفۂ الطاف و محبت زیب رقم ہوا ، شاد کام و منت گداز ہوں

یک بار نالہ کردہ ام از درد اشتیاق
از شش جہت ہنوز صدا می تواں شنید

آپ جانتے ہیں ، صبح کی چائے کے بارے میں میرا حال وہی ہے جو حاجی محمد جان قدسی کا تھا

ساقی بہ صبوحی نفسے بیشتر از صبح
برخیز کہ تا صبح شدن تاب نہ دارم

سفر ہو ، حضر ہو ، کوئی حالت ہو ۔ اس معمول میں فرق نہیں پڑتا ۔ گویا شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف یہی ایک وقت میرے حصہ میں آیا ہے ۔ قید خانے کی زندگی ایسی ہوتی ہے ، کہ قدرتی طور پر زندگی کی تمام معمولات درہم ہو جاتی ہیں - میں وہاں پہنچتا ہوں تو انتظار نہیں کرتا کہ تبدیلیاں اپنا تقاضا شروع کریں - خود بدل جاتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ وہاں کی تبدیلیوں کا پوری طرح ساتھ دوں لیکن صرف ایک چیز اس سے مستثنیٰ ہوتی ہے ، صبح چار بجے کی چائے یہ کمبخت وہاں بھی نہیں چھوٹتی

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

نینی سنٹرل جیل میں برابر یہ معمول رہا کہ صبح تین بجے اُٹھتا۔ پانی کی کیتلی اسٹوو پہ رکھ دیتا اور غسل کے لیے چلا جاتا۔ واپس آتا تو پانی اُبل اُبل کر اپنی تیاری کا اعلان کرتا۔ بلاتوقف چائے دانی میں چائے دم دیتا اور پھر جام و صراحی کی صُحبت میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیتا۔

حاصل کارگہ کون و مکان ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر اکہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست
پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داریم
خوش بیاسائے زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست

اس عالم میں کئی بار آپ کی یاد بھی آئی اور بے اختیار آئی ع

اے نسیم سحری یاد دہش عہد قدیم

ایک مرتبہ خیال ہوا کہ آپ کو کچھ لکھوں، آپ کے آخری خط کے جواب کا قرض بھی باقی تھا۔ لیکن پھر غور کیا کہ تو نینی سنٹرل جیل اور حبیب گنج کی باہمی مسافت اتنی دور دراز کی مسافت دکھائی دی کہ ہمت نہ پڑی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو امام مسلم نے مقدمہ میں عبداللہؒ بن مبارکؒ کا قول حجاج بن دینار کے رفع کی نسبت نقل کیا ہے۔ "بینہما مفاوز، تنقطع فیہا اعناق المطی" ایسی ہی مسافت میں نے بھی دیکھی کہ سامنے ہے۔ قلل الجبال و بینہن خیوف

رہائی کے بعد حالات نے دم لینے کی مہلت نہ دی رصحت بھی تغافل کرتی رہی۔ لیکن جب پچھلے سفر میں لاہور لوٹتے وقت دہلی ٹھہرا تو دہلی کی پچھلی صحبتوں کی یاد کے ساتھ آپ کی یاد بھی آئی اور اس طرح آئی کہ ضبط نہ کر سکا۔ دل کی صدائے درد زباں تک پہنچی اور زبان نے نوک قلم کے حوالہ کیا ع

ترا چہ شد کہ نمی پرسی آشنائے را

وہی صبح چار بجے کا وقت تھا۔ آصف علی صاحب کی کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ یکایک حکیم صاحب مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی۔ اُن کی یاد دہلی کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو گئی ہے۔ کہ یہ لفظ بغیر انہیں یاد کئے نہیں بول سکتا۔ دل کے بہت زخم ہیں۔ جو امتداد زمانہ سے داغ بن کر رہ گئے ہیں۔ ع اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

لیکن یہ زخم اب تک نہ بھر سکا۔

جوشید خون تازہ ز داغ کہن مرا

پھر ان کی یاد کے ساتھ وہ تمام صحبتیں ایک ایک کر کے سامنے آ گئیں۔ جو اُن کے دم سے گرم رہا کرتی تھیں اور وہ تمام حریفانِ محفل جو ان تمام صحبتوں میں ہم نفس و ہم آہنگ رہا کرتے تھے۔ ایک پوری مجلس نگاہوں کے سامنے پھر رہی تھی۔

مجنوں بہ ریگ بادیہ غمہائے خود شمرد
یاد زمانہ کہ غم دل حساب داشت

غم صرف اسی کا نہیں کہ یہ لوگ جدا ہو گئے، غم اس کا ہے کہ وہ دنیا ہی مٹ گئی جس دنیا میں یہ لوگ مخلوق تھے۔ اب نہ وہ دنیا واپس آسکتی ہے نہ وہ صورتیں اور سیرتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہم اس کاروانِ رفتہ کے چند پسماندگانِ راہ رہ گئے ہیں۔ جنہیں نہ تو قافلہ کا سراغ ملتا ہے، نہ منزل سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ نہ ہمیں کوئی پہچانتا ہے نہ ہم کسی کے شناسا ہیں۔

سراغ یک نگاہ آشنا در کس نمی یابم
جہاں چون نرگستان بے تو چشم کور می باشد

کیا عرض کروں، وردھا کے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہو سکنے کا کس درجہ افسوس ہوا۔ آج کل نظم ونسق کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو رہا ہے۔ کوئی ٹرین وقت پر کلکتہ نہیں پہنچتی۔ کمبخت، کلکتہ میل کو اسی دن وقت پر پہنچنا تھا۔ آپ سے ملاقات کا معاملہ میرے لئے وہی ہو گیا ہے جو غالبؔ کو پیش آیا تھا۔

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو؟

معلوم نہیں ادھر دہلی جانے کا کوئی موقع نکلتا ہے یا نہیں، لیکن اگر نکلے اور میں آپ کو اطلاع دوں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک دو دن کے لئے آپ بھی اس خرابہ میں آنکلیں۔ میں نے دہلی کو ایک خرابہ کہا، حالانکہ وہاں ایک نیا شہر آباد ہو چکا ہے ع

بایک جہاں کدورت بازایں خرابہ جائے ست

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

۱۹؍اے بالی گنج، سرکلر روڈ کلکتہ

۱۹؍اپریل ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

پچھلے خط کے جواب سے آپ نے شادکام نہیں فرمایا۔ مانع بخیر ہو۔

شراب لطف پر در جام می ریزی و می ترسم
کہ زود آخر شود ایں نشہ و من در خمار افتم

ابوالکلام

۲۴ر اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

شراب لطف من دارم خم اندر خم چہ می ترسی
نہ زود آخر شود ایں نشہ و نے در خمار افتی

مکرّم حبیب صدیق حمیم - السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
۱۹ر کا لطف نامہ آ گیا - للہ الحمد بافع بخیر ہے - سابق گرامی نامہ اور اس کا جواب دونوں برابر پیش نظر رہے - آپ کی گراں مصروفیت اور اس کے سلسلہ میں مسلسل نقل و حرکت بھی سامنے تھی، اس لیے مخل اوقات بننے کی جرأت نہ ہو سکی - اب انشاء اللہ جواب عرض ہو گا - اس وقت رفع گرانی کے لئے یہ چند الفاظ ارسال خدمت کر رہا ہوں - عافیت سامی کی دلی تمنا ہے -

نیاز کیش
حبیب الرحمٰن

کلکتہ
۴ر مئی سنہ ۱۹۴۲ء

صدیق مکرّم
حسب حالے نہ نوشتیم و شد ایّامے چند

کل الٰہ آباد سے تھکا ماندہ واپس آیا، تو طبیعت بہت بے کیف تھی۔ حسب معمول دوپہر کو کوئی کتاب لے کر لیٹنا چاہا، تو ابو طالب کلیم کا دیوان

ہاتھ آگیا - کھولا تو یہ غزل نکلی

نفس موافق طبع جہانیاں نہ کشی
کہ ہر کجا کہ تبسم خرند شیون باش
چو سقف خانہ ہوادار یک مقام مشو
گہے سحاب چمن گاہ دُودِ گلخن باش
بجز متاع تجرد بہ بار خویش مبند
بہ ہر سفر کہ روی شتر مسار رہزن باش

کیا عرض کروں کہ طبیعت کس درجہ محظوظ ہوئی - ساری تھکن مٹ گئی - کوئی ہم نفس نہیں جسے اس ذوق و کیف میں شریک کروں - خیال آیا کہ آپ کو زحمتِ التفات دوں - اُمید ہے بخیر و عافیت ہوں گے -

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ'

ابوالکلام

مولانا حبیب الرحمٰن شروانی ، رئیس حبیب گنج (علیگڑھ)

---

۱۰ / مئی

صدیق حبیب ،

نامۂ وداد لطف بیز ہوا - جو خط آتا ہے ، لطف تازہ لاتا ہے -

بہ میخانہ را ہم افتادہ ایست
کہ ہر شیشۂ رومی پری خانہ ایست

کلیم کے کلام نے سرور موفور بخشا - قلمی کلیات نکلوا کر ساری غزل پڑھی بیت الغزل یہی تین شعر ہیں - جو زیب قلم ہوئے - فارسی ادب کا ذوق گھٹنے

سے ملک نے بڑی نعمت کھودی۔ کیا جان فزا ادب تھا۔ دیکھئے کلیمؔ کے یہی تینوں شعر اصول زندگی ہو سکتے ہیں، وہ زندگی جو کامیاب و کام بخش ہو۔ ایک لطیفہ ہاتھ آیا۔ حافظ شیرازی کی لسان الغیبی مسلّم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تخلص کی برکت سے کلیمؔ نے بھی یہ فیض پایا ہے۔ جس "گرفت" سے آپ نے حال میں نجات حاصل کی۔ اس کی طرف ہر شعر میں اشارے ہیں

نفس موافق طبع جہانیاں نہ کشی — بہ ہر کجا کہ تبسم کنند شیون باش

قہقہوں اور تبسم کی کیا کمی تھی۔

بجز متاع تجرد بہ بار خویش مبند — بہ ہر سفر کہ روی شرمسار رہزن باش

اللہ در کلیم، رحمت بر کلیم۔ مرقع کھنچ گیا۔

بجواب گرامی نامہ ۲۴/ اپریل کو کلکتہ ضراعت نامہ بھیج دیا ہے حالیہ خط میں اس کا ذکر نہ دیکھنے سے واہمہ عدم رسی ہوتا ہے۔ یہ شعر زیب قلم فرمایا گیا تھا۔

شراب لطف پرور جام مے ریزی و من ترسم
کہ زود آخر شود ایں نشہ و نے در خمار افتم

جواب مداہنتہً تصرف کرکے عرض کیا تھا۔

شراب لطف من دارم خم اندر خم چہ مے ترسی
نہ زود آخر شود ایں نشہ و نے در خمار افتی

ایک روز کمال خجندی کا کلیات ہاتھ میں آگیا۔ دیکھا، پڑھا، دو شعر دل نواز بلکہ دل نشین ہوئے، عرض کردوں۔

کمال از کعبہ رفتی بر در یار — ہزارت آفریں مردانہ رفتی
بکویش آمدن اے دل ترا ساخت — کہ ہشیار آمدی، دیوانہ رفتی

ہزارت آفریں اے کمال! اس روز سے کتنی بار دونوں شعر پڑھتا ہوں

اور حیات تازہ کا لطف پاتا ہوں۔

للہ الحمد بخیر و آرزو مندِ عافیت احباب ہوں۔ والسّلام ختم الکلام

نیاز کیش

حبیب الرحمٰن

۱۹۔ اے بالی گنج، سر کلر روڈ، کلکتہ

۶ رمئی سنہ ۱۹۴۲ء

صدیق مکرّم

نامہ گرامی کے لیے شکر گذار ہوں۔

قلیل منک یکفینی ولکن

قلیلک لا یقال لہ قلیل

ابوالکلام

مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی۔ رئیس حبیب گنج علیگڈھ

کلکتہ

۲۰ رجون سنہ ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

ایک بات دریافت طلب ہے۔ محمد شاہی عہد میں آنندرام مخلص تھا۔
وزیر قمر الدین کا وکیل اور سراج الدین علی خاں آرزو اور شمس الدین فقیر کا ہم صحبت،

اس نے ایک کتاب مرآۃ المصطلحات لکھی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مجھے ملا ہے معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب کبھی چھپی ہے یا نہیں۔ اگر آپ کی نظر سے مطبوعہ نسخہ گذرا ہو تو مطلع فرمائیے۔

اُمید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، حبیب گنج، بھیکم پور علی گڈھ

دلیسر انگل لاج شملہ
۲۷؍ جون ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

ابوالکلام

یکم جولائی ۱۹۴۵ء

صدیق حبیب

جس دن بدر کامل گہن سے نکلا تھا۔ دل نے شہادت دی کہ نور محبت جاں نواز ہوگا۔ ہوا اور کس شان سے۔ ۲۷؍ جون کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ہنگامہ ایک گروپ کے رنگ میں نظر آیا۔ اس میں ایک پیکر محبوب بھی تھی۔ کھینچی لی،

مجمع اغیار سے جدا کیا۔ دیکھا۔ شیراز کی طرف سے صدا آئی۔

روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست
منت خاک درت بر بصرے نیست کہ نیست

اس غزل کا ایک اور شعر شاید بے موقعہ نہ ہو۔

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

خیر یہ شیراز کا ترانہ تھا۔ کان لگاتا ہوں تو شملہ سے دوسرا ترانہ سامعہ نواز ہوتا ہے۔

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

جو کانوں نے سنا، تیسرے روز نقوش دلفروزی کے پردے میں آنکھوں نے دیکھ لیا۔

اجازت ہو تو دوسرا مصرع میں بھی لکھ دوں۔

می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

حبیب الرحمٰن

وائسرِ ائگل لاج شملہ
۶ر جولائی ۱۹۴۵ء
صدیق مکرم
نامہ گرامی پہنچا۔ گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

دل حکایتوں سے لبریز ہے۔ مگر زبان درماندہ کو ابھی یارائے سخن نہیں۔ منتظر مہلت ہوں۔

ابوالکلام

وائسرائگل لاج، شملہ
۹ر جولائی ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم

نامۂ تعزیت کے لئے شکر گذار ہوں۔ ایک زخم ہو تو اس کا مرہم ڈھونڈھوں۔ اب تو دل سرتاسر زخم ہو چکا ہے

بیش ازیں صد داغ بر دل داشتم اکنوں یکے است

ملّا صاحب کی تعزیت کے لئے بھی شکر گذار ہوں۔

ابوالکلام

بہ مولانا ابوالکلام آزاد ہنگام ورود ایشاں بر گل مرغ کشمیر

محو نظارۂ گل مرغ نگارے دارم
کز خیالش بہ دل زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گر بہ حضورش گذری
عرضہ دہ شوق کہ درجان فگارے دارم
در بپرسد کہ مگر شوق پیامے دارد
سر فرود آرد زمین گوے کہ آرے دارم

در دوستاں را بہ نعمت یاد کردن ہمت است ٭ ورنہ ہر نخلے بہ پائے خویش افشاند ثمر

حبیب اسیر آزاد

۵ر رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء

نسیم باغ، سری نگر (کشمیر)
۲۶ راگست ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم
زندگی میں بہت سی جستجوئیں کی تھیں۔ لیکن اب ایک نئی جستجو پیچھے لگ گئی ہے، یعنی اپنی گم شدہ صحت کا سراغ ڈھونڈھ رہا ہوں

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

اطبا نے کشمیر کی وادیوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا، چنانچہ گلمرگ پہنچا اور تقریباً تین ہفتے وہاں بسر کئے۔ لیکن گم شدہ صحت کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اب سری نگر آگیا ہوں اور ہاؤس بوٹ میں نسیم باغ کے پاس مقیم ہوں فیضی نے یہاں بارِ عیش کھولا تھا۔

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

میرے حصہ میں ناخوشی و علالت کا بوجھ آیا ہے۔ اسے سر پہ اٹھائے یہاں آیا تھا، اور سر پہ اٹھائے واپس جاؤں گا۔ یہ کشمیر کی جان پرور آب و ہوا کا قصور نہیں ہے۔ میرے جسم ناساز کا قصور ہے

ہر چہ ہست از قامتِ ناسازِ بے اندامِ ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست

۱۹ کو جب گلمرگ سے سری نگر آرہا تھا۔ تو راہ میں ڈاک کھولی۔ اور آپ کا نامہ منظوم ملا۔ کیا عرض کروں، کس درجہ طبیعت متاثر ہوئی، سرتا پا

شکر گذار اور ہمہ تن رہینِ منت ہوں

قلیل منک یکفینی ولاکن
قلیلک لا یقال لہٗ قلیل

یہ خط آپ کے نامۂ منظوم کی رسید ہے جو مجھ کو لکھنا ہے، اس کے لئے مہلت کا انتظار کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ ایک دو دن کے اندر کسی نہ کسی طرح وقت نکالوں گا۔ والسلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ"

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی، حبیب گنج (علیگڈھ)

نسیم باغ۔ سری نگر
۴؍ستمبر ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم
وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ داہنی طرف جھیل کی وسعت، شالامار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے، بائیں طرف نسیم باغ کے چنار کے درختوں کی قطاریں دُور تک چلی گئی ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں

گرچہ دُوریم بہ یادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا — وہ ۴؍اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جا رہا تھا۔ ریل میں

خط لکھ کر رکھ لیا کہ اجمل خان صاحب کے حوالے کر دوں گا کہ نقل رکھ کر ڈاک میں ڈال دیں۔ آپ کو یاد ہو گا۔ کہ انہوں نے نقول رکھنے پر اصرار کیا تھا۔ لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح گم ہو گیا۔ کہ خط بھیجنے کا خیال نہ رہا۔ ۹ راگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کر کے احمد نگر لے جا رہے تھے تو راہ میں بعض کاغذات دیکھنے کے لئے اٹاچی کیس کھولنا پڑا اور یکایک وہ خط سامنے آ گیا۔ اب دنیا سے تمام علائق منقطع ہو چکے تھے اور ممکن نہ تھا کہ خط ڈاک میں ڈالا جا سکے۔ میں نے اسے اٹاچی کیس سے نکال کر کاغذات کے ایک فائل میں رکھ دیا۔

دو بجے ہم احمد نگر پہنچ گئے۔ اور بیس منٹ کے بعد قلعہ کے اندر مقید تھے۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر تھی۔ اور اس میں جو قید خانے کی چار دیواری کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہو گئی

کیف الوصول الی سعاد ودونہا

قلل الجبال وبینہن حتوف

دوسرے دن یعنی ۱۰ راگست کو حسب معمول صبح تین بجے اٹھا، چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہنا ہے۔ وہاں بھی سامان کے ساتھ آ گیا تھا۔ چائے دم دی، فنجان سامنے رکھا اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مختلف گوشوں میں بھٹکنے لگے تھے۔ اچانک وہ خط جو ۳ راگست کو دہلی میں لکھا تھا۔ اور کاغذات میں پڑا تھا، سامنے آ گیا۔ بے اختیار خواہش پیدا ہوئی کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں۔ اور آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں، مگر روئے سخن آپ کی طرف پھیر دوں۔ چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہو گیا۔ پھر اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مختلف

مکتوبات قلم بند ہونے سے آگے چل کر بعض دوسرے احباب اعزہ کی یاد بھی سامنے آتی رہی اور ان کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ بزم سخن آراستہ ہوتی رہی۔ قید خانے میں باہر کی دنیا سے علائق یک قلم منقطع ہو چکے تھے۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکینگے یا نہیں۔ تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلبگاریوں نے کچھ ایسا مجبور کر دیا تھا کہ قلم اُٹھا لیتا تو پھر رکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام قاصد کی سے لیا ہے میرے حصے میں عنقا آیا ہے

ایں رسم و راہ تازہ ز حرماں عہد ماست
عنقا بہ روزگار کسے نامہ بہ نہ بود

۱۰ اگست ۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء کے اواخر تک ان کا سلسلہ بلا انقطاع جاری رہا تھا لیکن اس کے بعد رُک گیا۔ کیونکہ ۹ اپریل ۴۳ء کے حادثہ[1] کے بعد طبع واماندہ حال بھی رُک گئی تھی۔ اور اپنی درماندگیوں میں گم تھی۔ اس زمانہ میں بعض مصنفات کی تحریر کا کام بدستور اپنے مقررہ اوقات میں ہوتا رہا۔ اور جو معمولات قلعہ احمد نگر کی زندگی میں قرار پا گئے تھے، اُن میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، تاہم یہ حقیقتِ حال چھپانا نہیں چاہتا کہ یہ جو کچھ بھی قرار و سکون کی حالت تھی، جسم و صورت کی تھی۔ قلب و روح کی نہ تھی جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا تھا، مگر دل کو نہیں بچا سکتا تھا ع

دلے دیوانہ دارم کہ در صحرا است پنداری

اس کے بعد بھی گاہ گاہ واقعات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں۔ تاہم سلسلہ کتابت کی وہ تیز رفتاری قائم نہ رہی جو اوائل

---

[1] رحلتِ شریکِ حیات ۱۲ شاہد شروانی

میں سامنے دینی رہی تھی۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی۔ تو طبیعت کی آمادگیوں نے بالکل جواب دے دیا تھا۔ بانکوڑا میں صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکا۔ اور کسی بات کی طرف طبیعت متوجہ نہ ہو سکی۔ آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل و حالات کی نسبت ایک عزیز کے نام قلم بند ہوا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے۔ اس پر یہ داستان بے ستون و کوہ کن ختم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ زندگی ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔

شمہ از داستانِ عشق شور انگیز ماست
ایں حکایت ہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

غور کیجیے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ تین برس ہوں، یا تین دن، تین گھنٹے ہوں یا تین لمحے، لیکن جب گذرنے پر آتے ہیں تو گذر ہی جاتے ہیں ؎

زیں ہوسہا بگذرد یا نہ گذرد می گذرد

رہائی کے بعد جب ۱۲ر جون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اور اسی دوست کے یہاں اسی کمرے میں ٹھہرا، جہاں تین برس پہلے اگست ۴۲ء میں ٹھہرا تھا تو یقین کیجیے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسا ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کا سارا ماجرا کل کی بات تھی۔ اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گذر چکا وہ خواب تھا۔ یا جو کچھ اب دیکھ رہا ہوں، وہ خواب ہے؟

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جس دن بانکوڑا میں رہا ہوا تھا۔ یہ تمام مکتوبات نکالے تھے اور ایک

فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیئے تھے خیال تھا کہ انہیں نقل کرنے کے لئے دے دوں گا۔ اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ لیکن شملہ میں بعض احباب کی نظر سے بعض مکاتیب گذرے تو وہ مصر ہوئے کہ انہیں بلا تاخیر طباعت کے لئے دے دوں۔ چنانچہ اب ایک خوشنویس مراد آباد میں اُن کی کتابت کر رہے ہیں۔ اور تمام مسودات انہیں کے پاس ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب وہ ایک رسالہ کی صورت میں شائع ہو جائیں گے اور میں قلمی مکاتیب کی جگہ مطبوعہ مکاتیب کا نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ اس سلسلہ میں پہلا مکتوب شملہ میں ایڈیٹر صاحب اخبار مدینہ نے اجمل خاں صاحب سے لے لیا تھا۔ جو اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گذرا ہو۔ "صدیق مکرم" کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ رُوئے سخن آپ ہی کی طرف تھا

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

مکتوبات کے دو حصّے کر دیئے ہیں غیر سیاسی اور سیاسی۔ ابھی پہلے حصّے کی کتابت ہو رہی ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا استثناء آپ کے نام ہیں۔

پرسوں ۷ر کو یہاں سے دہلی جا رہا ہوں۔ چونکہ امریکن دوستوں کی عنایت سے ہوائی جہاز کا انتظام ہو گیا ہے۔ اس لئے ڈھائی گھنٹہ میں دہلی پہنچ جاؤں گا۔ اور پھر عید وہاں کر کے بمبئی کا قصد کروں گا۔ ۱۰ر سے ۱۴ر تک وہیں قیام رہے گا۔

ابوالکلام

مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی حبیب گنج ضلع علیگڑھ

۴ر مئی

غبارِ راہ گشتم، سرمہ گشتم توتیا گشتم
بچندیں راہ گشتم تا بہ چشمت آشنا گشتم

صدیق حبیب، بہ دل قریب۔

اس روز لکھنؤ میں نظارۂ جمال اگرچہ ع

"خوشش درخشید ولے دولت مستعجل بود"

کا مصداق تھا۔ تاہم دل میں گرمیٔ شوق پیدا کرنے میں کامیاب تھا، دن[1] بھر مکرر شوقِ لقا کی تمنا رہی، شب کو دوبارہ ٹیلیفون کیا، مگر ہجوم مشاغل ساعی باریابی میں حارج رہا۔ تقاضائے شوق تھا۔ کہ چند ساعتیں لطفِ صحبت بخشیں۔ دَورِ چائے ہو۔ ایک تازہ مضمون گوش گذار کردں، مگر دل کی تمنّا دل میں رہی۔ اسی عرصہ میں دو نسخے "غبارِ خاطر" کے نور افزا ہوئے غبار اور نور افزائی، ہاں نور افزائی غبار تھا۔ کوئے دوست کا، آنکھوں سے لگایا پڑھا۔ پڑھوں گا۔ زہے قسمت کہ گوشۂ تنہائی میں انیسِ صحبتِ حبیب رہا۔ بزم انس اس قدر طویل کہ ایک جلد کا سامان تھی۔ میرا خیال ہے۔ کہ یہ واقعہ تاریخی واقعہ بنے گا۔

"شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو"

---

[1] دن کے بجائے دل قلم سے نکل گیا۔ اس پر نواب صاحب نے یہ نوٹ دیا:۔ دیکھئے گرمیٔ شوق کا اثر" دن کے بجائے قلم سے" دل" نکلا۔ شاہد شروانی۔

باز آئیم بر سر مطلب تازہ مضمون یہ تھا:-

شکر للہ کہ بروئے تو قدح می نوشیم
جلوۂ قرب نمودہ سفرِ جسمانی

(حسرت شروانی)

گرچہ دُوریم بہ یادِ قدح می نوشیم
بعدِ منزل نہ بود در سفر روحانی

ہی ابھی غالب ہے۔

تمنا تھی کہ چائے کا پیالہ ہاتھ میں، یہ مضمون زبان پہ ہوتا۔ خیر وہ تمنا پوری نہ ہوئی تو تحریر کے ذریعے سے سُنا دیا۔ کبھی انشاء اللہ تمنائے لقا بھی حاصل ہو جائے گی۔

آج کل آپ کی مصروفیتیں قلم روک رہی ہیں۔ اس لئے ختم کلام۔

والسّلام ختم الکلام

نیاز نشان حبیب الرحمٰن

اجمل خاں صاحب مکرّم

اوّل تعمیل ارشاد ہوئی۔ اس کے بعد مطالعہ۔ دونوں نسخے صحیح کر لئے گئے۔

شملہ

۱۱ رمئی ۱۹۴۶ء

صدیق مکرّم۔ نامۂ گرامی کے لئے شکریہ۔ جونہی مہلت ملی، مخاطبت کی خوش وقتی حاصل کر دوں گا۔ والسّلام علیکم

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس حبیب گنج ضلع علیگڈھ

کاروانِ خیال کا پروف تیار ہو چکا تھا۔ کہ مراسلت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ جی چاہا کہ ان خطوط کو بھی شامل مکاتیب کر دیا جائے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے میری گذارش پر یہ خطوط بھی عنایت فرما دیے۔ مولانا آزاد کا مراسلہ تحفہ "دہا مٹ جیسمین" کا عین عید الاضحیٰ کی صبح کو نواب صاحب کو وصول ہوا۔ نواب صاحب کے آخری خط میں جس مجلسِ چائے نوشی کا ذکر ہے اس میں اپنی خوش بختی سے مَیں بھی شریک تھا۔ بلکہ اس مجلس کا انعقاد ہی مجھ پر کرم بے پایاں کا ثبوت تھا۔ لطف و اتفاق کی بات یہ ہے کہ نواب صاحب ہمرنگ چائے مخملی ٹوپی زیبِ فرق فرمائے ہوئے تھے۔ اس منظر کے ساتھ دلگیر اکبر آبادی مرحوم کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آ گیا۔

عکسِ جمالِ کلاہ ہے جامِ شراب میں
اک آفتاب اور بھی ہے آفتاب میں

شاہد شروانی، یکم نومبر ۱۹۴۶ء

مسوری، ۱۸ جون ۱۹۴۶ء

صدیقِ مکرم۔ آپ کا ہر مکتوب پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔ مگر آخری مکتوب پڑھ کر خصوصیت کے ساتھ طبیعت مسرور ہوئی۔ اول تو اس لئے کہ آپ نے ایک چیز کی فرمائش کی، پھر فرمائش بھی کی تو ایسی چیز کی جس سے اشتراکِ ذوق کا رشتہ اور زیادہ استوار ہو گیا۔ یعنی چینی چائے کی۔

دوائے دردِ دل خود ازاں مفرح جوئے
کہ در صراحی چینی و شیشہ حلبی است

مگر سوئے اتفاق دیکھئے۔

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

وہائٹ جیسمین چائے ختم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ ایک دوسری چینی چائے سے کام لے رہا ہوں جو کلکتہ کے ایک چینی دوست نے بھیجی تھی۔ سفر میں جس قدر ساتھ تھی اس کے دو حصّے کئے ایک حصّہ رکھ لیا۔ ایک حصّہ مرسلِ خدمت ہے شرمندہ ہوں کہ اس قلیل مقدار سے زیادہ اس وقت نہ بھیج سکا۔

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشم کم مبین
ایں نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ام

وہائٹ جیسمین اُمید ہے کہ ۱۵ جون تک کلکتہ پہنچ جائے۔ چار ڈبوں کی توقع ہے۔ دو ڈبے بلا تاخیر مرسلِ خدمت ہوں۔ کلکتہ اطلاع دے رہا ہوں، تاکہ براہِ راست روانہ کر دیئے جائیں۔

اعلیٰ درجہ کی سبز چائے بھی آج کل نہیں ملتی۔ وہ بھی منگوائی ہے۔ اگر آگئی تو اس میں بھی آپ شریک مساوی ہوں گے۔

جو چائے بھیج رہا ہوں وہ بھی بُری نہیں ہے۔ لیکن وہائٹ جیسمین کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی بہت کم مقدار چائے دانی میں ڈالنی چاہئے ورنہ تلخ ہو جائے گی۔

نیز ضروری ہے کہ کم از کم پانچ منٹ تک، توقف کیا جائے۔ میں دس منٹ تک انتظار کرتا ہوں۔

ابوالکلام

دہلی
۱ر نومبر ۱۹۴۶ء

صدیقِ مکرم
سید نظیر حسین والا نامہ لے کر آئے جو کچھ اُن کے لئے کر سکتا تھا، کر چکا ہوں، اُمید ہے کہ سود مند ہو گا۔ عرصہ ہوا کہ مسوری میں آپ کا ایک والا نامہ ملا تھا جس میں وہائٹ جیسمین چائے کی فرمائش تھی۔ اس وقت میں خود تشنہ لب تھا۔ اِس لئے عذر خواہ ہوا اور ایک دوسری چینی چائے بطور نمونہ کے بھجوا دی۔ اب وہائٹ جیسمین کا ایک ڈبہ آ گیا ہے۔ اس میں سے تھوڑی سی یہاں رکھ لی ہے۔ باقی روانۂ خدمت کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ پسند خاطر ہو۔

مے خور بہ شعر بندہ کہ دل تنگیت مباد
بعد از تو خاک بر سر اسباب دنیوی

بہت جی چاہتا ہے کہ یک جائی کی صورت نکلے لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیا کروں، ادھر قصد کر رہا ہوں کہ کچھ عرصہ دہرہ دون میں قیام کر دوں۔ کیونکہ صحت جواب دے رہی ہے۔ اور ڈاکٹروں کا تقاضا ہے کہ دو تین ہفتے سکون خاطر کے ضرور نکالوں۔ کاش ایسا ہو سکتا۔ کہ آپ دو چار دن کے لئے دہرہ دون تشریف لا سکتے اور میرے ساتھ قیام فرماتے۔

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو شکایت کنم از ہر بابے

اُمید ہے مزاج گرامی بعافیت ہو گا

مخلصکم الوفی ابوالکلام

حبیب گنج، ضلع علی گڈھ
۱۷ ذی الحجۃ الحرام ۱۳۶۵ھ

"صدیق مکرم" کے مکرم باکرامت السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
اوّل تبریک عید پیش کروں۔ اپنے استاذ الاستاذ مولانا سید حسین شاہ صاحب واصف بخاری مرحوم کی ایک برجستہ رباعی سناؤں۔

غم زہر سینہ بعید است کہ عید است امروز
دہ! چہ روزِ خوش و میمون و سعید است امروز
ترک تا زالم و شامِ غم و صبحِ طرب
ہر عید است و ہر عید است و وعید است امروز

اس کے بعد شکریہ یاد فرمائی ادا کروں۔ لفافہ انگریزی میں تھا معمولی تحریر خیال کی کھولنے کو اُٹھا تو اسم گرامی مرقوم تھا۔ جنبشِ شوق کے ساتھ کھولا۔ نقوش تاباں دیدہ افروز دل نواز ہوئے۔

چائے خطائی کی آمد کا مژدہ پڑھا۔ دل چاہا کہ چائے پی لوں تب شکرانہ کرامت پیش کروں۔ چائے آئی۔ کیا خوب آئی۔ پی۔ دل نے گرمیِ محبت کے ساتھ وادیِ خطا کی سیر کا لطف حاصل کیا۔

ایک زمانہ کی سنی ہوئی رباعی ایرانی شاعر کی نوشتہ یاد آئی۔

اے چائے چہ گویمت یہ ہائی
در عالمِ جسم کیمیائی
دریا کی مطینت خطانیست
ہر چند کہ زادۂ خطائی

اس سلسلے میں ایک عجیب حُسنِ اتفاق ہے جب کہ آپ کی چائے کی فنجان سے ہاتھ گرم ہوا۔ اردو کا ایک رسالہ کھول کر پڑھا۔ بسر آغاز "عنبرین چائے" کے عنوان سے ایک نوٹ نظر آیا۔ گویا آپ کی اور آپ کی چائے کی تصویر تھی۔ کمالِ تصور یہ کہ سطر آخر لفظ آزاد سے مزین ہے۔ تماشہ ہنوز نامہ شوق کرتا ہوں۔
کششِ شوق اس سے بھی بڑھ کر کرشمے دکھاتی ہے۔

دو الطاف نامے سامنے ہیں۔ ایک میں آمد چاء کی خبر ہے۔ دوسرے میں قدوم
دہرہ دون کی۔ اس کے ساتھ مخلص کی یاد فرمائی۔ یقین کیجئے دل مسرت شوق سے
تڑپ گیا۔ آئیے آئیے انشاءاللہ تعالیٰ لطفِ ہم دلی و ہم نشینی حاصل ہو گا۔ مُلاجی
بھی ساتھ ہوں گے۔ خبر سُن کر ابھی سے دو بجے رات کو دُودھ لانے کا سودا پکا
رہے ہیں۔ ماشاءاللہ کیا پُر لطف فقرہ لکھا جبکہ:۔

گرچہ دُوریم بہ یادِ تو قدح می نوشیم — بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

کے جواب میں اپنا ایک شعر عرض کروں گا:۔

شکر للہ بروئے تو قدح می نوشیم — جلوۂ قرب نمودہ سفرِ جسمانی

آپ کی صحت صرف آپ کی ملکیت نہیں ہے ملک و ملت برابر کے بلکہ
شریک غالب ہیں۔ ایک با اخلاص مخلص بھی۔ لہذا اس کی حفاظت کی خاطر سے
آرام کیجئے۔ دہرہ کا سفر کیجئے، مخلص کی یاد فرمائی ہو۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ عافیت
سے ہوں۔ آپ کی صحت و عافیت کا دل سے متمنی۔ والسلام ختم الکلام۔

نیاز نشان حبیب الرحمٰن

عنبرین چائے

.....یوں تو وقت پر ہر چاء مزا دیتی ہے لیکن جو لطف جو کیف اور جو مستی۔
سفید، چمیلی، اور عنبرین چائے میں ہے، وہ بات کچے گھڑے والی کو کہاں نصیب، صبح
کے وقت کیتلی سامنے ہو، اور اگر دم دیتے بن پڑے تو ایسا لون، پیدا ہو کہ ارغوانی کو
انسان بھول جائے اور پھر کوئی رنگ نظر میں نہ سمائے۔ کیتلی سے فنجان میں آئے، معلوم ہو
کہ شیشے میں پری اُتر آئی، اور اگر ایک جرعہ حلق سے نیچے اُتر جائے تو ہر گرفتار۔
"آزاد" بن جائے۔

اسلامیات

حقیقت روح انسانی	۱٫۵۰
اصحاب کہف	۱٫۵۰
اسلام اور آزادی	۱٫۲۵
رسول خدا کا دشمنوں سے سلوک	۲٫۰۰
قران اور اقبال	۱٫۶۲

تاریخ سوانح اور سفر نامہ

تزک تیموری	۲٫۵۰
زک بابری	۳٫۵۰
تزک جہانگیری	۷٫۵۰
ہمایوں نامہ	۵٫۵۰
جلیانوالہ باغ	۳٫۲۵
بابا فرید گنج شکر رح	۲٫۵۰
حضرت مجدد الف ثانی رح	۱٫۵۰
سیرت بایزید رح	۲٫۵۰
منزل شوق (سفر نامہ حج)	۳٫۵۰
شہید کربلا قرآن کی روشنی میں	۳٫۰۰

ادب

کاروان خیال	۱٫۵۰
رباعیات انیس	۱٫۵۰
انتخاب مومن	۱٫۵۰
انتخاب غالب	۱٫۵۰
مثنوی سحر البیان	۳٫۵۰
باغ و بہار	۴٫۰۰
دیوان غالب	۲٫۰۰